GUL-E-TAR
BY SHAKEEL IBNE SHARAF
گلِ تر
Created By
CreationGraphics
Dhule@9226149098
شکیلؔ ابنِ شرفؔ
Designed By
Creation@9226149098

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گُلِ تر

مجموعۂ غزل

شکیلؔ ابن شرفؔ

گلی نمبر 7، تاشہ گلی، دھولیہ۔

نام کتاب .... گُلِ تر

شاعر .... شکیلؔ ابن شرفؔ

سالِ اشاعت .... مارچ 2019

تعداد 1000

کتابت .... عنم آرٹس

سرِ ورق .... محمد آصف، کریشن گرافِکس ، دھولیہ

ناشر .... بزمِ محبانِ شکیلؔ......دھولیہ۔

قیمت .... 150 روپئے

طباعت .... نورانی پریس، مالیگاؤں۔

خوشبو کا بدن (2004)......مہکار (2012)......گُلِ تر (2019)

ملنے کے پتے......☆

شکیلؔ ابن شرفؔ............ گلی نمبر 7، تاشہ گلی، دھولیہ۔

مدینہ بُک ڈپو............نزد جامع مسجد، مولوی گنج، دھولیہ۔

شبنم بُک اسٹال............ قصاب باڑہ مسجد، مچھلی بازار، دھولیہ۔

نسرین ڈِپو............ نندی روڈ، دھولیہ۔

انتساب

ان تمام ادب نواز کرم فرماؤں کے نام

جن کے تعاون سے

یہ مجموعۂ کلام اشاعت پذیر ہوا۔

جزاک اللہ خیراً

یہ نصف صدی کا قصہ ہے

ڈاکٹر الیاس صدیقی مالیگاؤں

شکیلؔ ابن شرفؔ نے کم عمری میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً 1970ء سے نصف صدی قبل جب انہوں نے شاعری کا آغاز کیا تو شہر دھولیہ کے گلی کوچوں میں شعر وسخن کے چرچے تھے اساتذۂ کرام اور ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد طبع آزمائی میں شبانہ روز مصروف رہتی تھی۔ مشاعرے برپا ہوتے شعری محفلیں سجتیں، ہر استادِ سخن کا اپنا حلقہ تھا، سیکھنے سکھانے کا جذبہ تھا۔ اساتذہ رہنمائی کرتے، شاگرد، اُن سے استفادہ کرتے اور اپنے شہر کو ہندوستان میں ایک اہم اور قابل توجہ ادبی مرکز کے طور پر متعارف کروانے میں حصہ دار بنتے رہے۔ ملک کے نامور اساتذۂ سخن مولانا انجم فوقی بدایونی، علامہ نوح ناروی، تجمل حسین جلالپوری اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ کے دورے ہوتے اور محفل شعر وسخن کی رونق بڑھ جاتی۔ آج محسوس ہو رہا ہے کہ دھولیہ شہر سے شعر وسخن کا موسم بہار رخصت پذیر ہے، خزاں کی آمد آمد ہے، درخت سوکھ رہے ہیں، پتے مرجھا رہے ہیں اور جھڑ رہے ہیں، پھولوں نے کھلنے کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔ سبزہ زار لق و دق صحرا میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ شہر میں چند ہی شعراء رہ گئے ہیں جو اپنے بزرگوں کا ورثہ سنبھال رہے ہیں۔ قدیم ماحول کے پروردہ یہ شعراء نہ ہوتے تو آج دھولیہ میں شعر وشاعری کا نام لیوا بھی کوئی نہ ہوتا۔ ان ہی شعراء کی صف اوّل میں شکیلؔ ابن شرفؔ بھی جلوہ افروز ہیں جو کل کے موسم بہار اور آج کی فصلِ خزاں یعنی گذشتہ پچاس برسوں کے نشیب وفراز کے عینی شاہد ہیں اور اپنی شاعری کے چند خوبصورت پھولوں کی مدد سے بہار واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ موسم بہار کی یادیں ان کے دل میں ہی نہیں بلکہ لاشعور میں پیوست ہیں شاید اسی لئے انہوں نے اپنے تینوں مجموعوں کے ناموں میں 'بہار' یہ عنصر شامل رکھا ہے۔ خوشبو کا بدن، مہکار اور گلِ تر۔۔۔۔۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ایک اِک تصویر ہے محفوظ اب تک ہو بہو اے تصور تجھ سے بڑھ کر کوئی بھی البم نہیں

شکیلؔ ابن شرفؔ نے اسکولی تعلیم صرف نویں جماعت تک ہی حاصل کی لیکن تعلیم کی اس کمی کو

ان کے فارسی کے استاد مولوی عبدالوہاب انجم دھولیوی نے پورا کر دیا جنہوں نے شکیلؔ کو زبانِ فارسی گلستاں بوستاں تک پڑھائی جس سے ان کے اندر ذوقِ شعری بھی پیدا ہوا اور طبیعت کو روانی اور موزونی کا تحفہ بھی مل گیا۔ جو کسر رہ گئی تھی اسے استادانِ سخن حضرت شمس الدین زاید دھولیوی نے مکمل کر دیا۔ آج خود شکیلؔ ابن شرفؔ کا اپنا حلقۂ شاگردان ہے جن کی اصلاح و تربیت کا فریضہ وہ انجام دے رہے ہیں۔

تخلیق کی دنیا میں روایتوں کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ بعض فرسودہ روایتیں ہوتی ہیں جن سے احتراز کرنا ہر فنکار کے لئے لازمی ہے۔ یہ تخلیق کار کے لئے سدِّ راہ ہوتی ہیں۔ جن کے تعلق سے مجروحؔ سلطان پوری نے کہا تھا۔

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں　　　ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

جہاں تک شکیلؔ ابن شرفؔ کا سوال ہے انہیں روایتوں سے انکار نہیں بلکہ وہ تو کہتے ہیں۔

ہم ادب میں ہیں روایت کے طرف دار ضرور　　　روش اپنی مگر اوروں سے جدا رکھی ہے

''گلِ تر'' کے مطالعہ کی بنیاد پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری صحت مند اور توانا روایات کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں۔

اپنی اصل سے کٹ جانا محرومی ہے　　　زرد ہؤا تو شاخ سے پتہ ٹوٹ گیا

(ڈاکٹر الیاس صدیقی)

اس شاعری میں حسن عشق کی شیرینی کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کی کڑواہٹ بھی ہے۔ اوّل الذکر کی چند مثالیں۔

جانتا ہوں کہ تو نہ آئے گا　　　پھر بھی رہتا ہے انتظار ترا

اُس کی آنکھیں تھیں ستارہ جیسی　　　اس کا چہرہ تھا گلابوں جیسا

اگر کمال نہیں یہ تمہاری چاہت کا　　　میرے وجود میں کس نے بحال کی خوشبو

دل کوتڑپاؤ نہ یوں بننا سنورنا چھوڑ کر　　　سادگی نے اور تم کو خوبصورت کر دیا

صاف نظر آتا ہے ان کی شاعری میں حسن عشق کے رنگ شوخ اور گہرے نہیں بلکہ ہلکے، خوشنما اور جاذب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اساتذہ کے چبائے ہوئے نوالوں کو منہ میں رکھ کر نہیں پھرایا بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے بل پر اپنا راستہ الگ نکالا ہے۔ کبھی کبھی تو اشعار میں بلاغت کی چاشنی اور فصاحت کی دلکشی کے ساتھ ایک قسم کی برجستگی کی موجودگی عجیب لطف دے جاتی ہے۔ مثلاً ؎

جب بھی تو میرے آس پاس رہا — چاند پہروں اداس اداس رہا

میں نے مانگا جب اس کا ہاتھ شکیلؔ — ہنس پڑا وہ سوال پر میرے

اس دوسرے شعر میں عصر حاضر کا عکس صاف دکھائی دے رہا ہے۔ آج کل دو محبت کرنے والے شادی کے بندھن میں بندھ کر رہنے کو شوق فضول جانتے ہیں۔ گناہوں کی دنیا اس قدر آباد اور قانون کا سہارا اتنا مضبوط ہے کہ انسان بنا شادی کئے وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے جو ایک شادی شدہ جوڑے کا حصہ کہلاتا ہے۔ محبوب کا ہنس پڑنا یہاں اندرونی خوشی کا عکاس نہیں کیونکہ ''خوشی اور مرضی'' کے استعارے کے طور پر ''شرمانے'' کا محل تھا۔ اس لئے اس کی یہ ہنسی عاشق کی سادگی، معصومیت اور ناواقفیت کا مضحکہ اُڑانے کے معنوں میں ہی لی جائے گی۔

ایک اور خصوصیت جو قاری کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی شاعری میں برجستگی اور بے ساختگی کے عناصر کی موجودگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی شکیلؔ ابن شرفؔ کی شعری شناخت بھی ہے۔ اِسی قسم کے اشعار کے ذریعے وہ نہ صرف مشاعروں میں اپنی دھاک جما لیتے ہیں بلکہ سامعین کے دِل میں اپنے لئے احترام کا مقام بھی بنا لیتے ہیں...... مثالیں بہت سی ہیں یہ چند ایک دیکھئے ؎

عزیزو میرا حال خود دیکھ لو — مِرے کام آئی شرافت کہاں

ہم تو دِل اپنا صاف رکھتے ہیں — اُن کے دِل میں غبار ہے تو رہے

مجھ کو معلوم ہے تو میرا نہیں ہے لیکن — میرے آنکھوں میں بسے خواب کہاں جانتے ہیں

کہاں جاتے ہو یوں برباد کر کے — بہت روؤ گے ہم کو یاد کر کے

بول جو بولنا ہے پر یہ بتا　　　　تیرے منہ میں زبان کس کی ہے

اپنے عاشقانہ جذبات کے باوصف وہ ایک حسّاس دِل انسان کے ناطے اپنے آس پاس کے حالات وواقعات سے بے خبر نہیں رہتے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے انسانی رشتوں کی بے حرمتی دیکھ رہے ہیں۔ ناانصافی اور ظلم کا تماشہ دیکھ رہے ہیں، ہنگامہ ریزیوں اور تشدد آمیز کاروائیوں کا مشاہدہ کرر ہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے۔ انسان کی فریب کاریاں اور مکاریاں اظہر من الشمّس ہیں، کوئی کسی کا پُرسان حال نہیں ایک بے حسی ہر ایک کے دِل پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ ہمدردی، غمگساری اور ملنساری کے جذبات عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنی شاعری میں انہوں نے اِن عصری مسائل کا اس خوبی سے احاطہ کیا ہے کہ داد دِیئے بغیر نہیں رہ سکتے......دیکھئے۔

کیوں گلے مِل رہا ہے بڑھ بڑھ کر　　　　کیا اِرادہ ہے میرے بھائی کا

ہر کسی سے بنائے رکھتا ہے　　　　کیوں نہ وہ شخص فائدے میں رہے

دوستو جاؤ اپنا کام کرو　　　　چھوڑ دو مجھ کو حال پر میرے

سچی شاعری کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ سیدھے دِل میں اُترتی ہے۔ ''گُلِ تر'' کی غزلوں میں سچی شاعری کی خصوصیات موجود ہیں۔ اِس میں الفاظ کی سادگی ہے، لیکن رؤکھا پن بالکل نہیں ہے۔ حالات کی تلخی کا بیان ہے، فصاحت کا حُسن ہے، اخلاص کی خوشبو ہے، جدت طرازی ہے، لہجے کا تیکھا پن ہے، ایک دلِ دردمند کا نوحہ ہے، نیک جذبات رکھنے والے دِل کی تمنّائے اصلاح ہے، اس میں انسانی ہمدردی اور مروت کے جذبات خون بن کر دوڑتے ہیں اور سب سے بڑھ کر شاعر کا وہ طاقت ور اسلوب ہے جو ایک معمولی سے موضوع کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے اور بے تکلف اندازِ بیان ان اشعار کو بُلندی عطا کرتا ہے۔ یہ مجموعہ یقیناً شکیلؔ ابن شرفؔ کے قد میں اضافہ کرے گا۔

میری دُعا ہے کہ ''گُلِ تر'' کو نیک مقبولیت عطا ہو اور شکیلؔ ابن شرفؔ کے نام کو مزید بُلندیاں نصیب ہوں۔

مورخہ ۲۶ نومبر ۲۰۱۸ء بروز پیر، مالیگاؤں۔

شکیلؔ ابن شرفؔ 'گلِ تر' کے آئینے میں

محمد رفیع انصاری، بھیونڈی

ایک زمانے میں بھمڑی میں حضرت کلیمؔ دھولیوی گاہے گاہے تشریف لاتے تھے۔ جب بھی آتے شعری محفلوں میں ان کے نام کی دھوم پڑتی۔ کیا پیر مرد تھے، جب وہ غزل سرا ہوتے، تو قدیم شعری محفلوں کا حسن و جمال آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ان کا لب ولہجہ، ان کا اندازِ شعرخوانی، ادب آداب، ان کی سادہ دلی سادہ گوئی دل پر نقش ہوگئی تھی۔ گو آج اس بات کو عرصہ بیت گیا ہے لیکن ابھی تک ذہن و دل پر دھولیہ کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ ابھی ابھی دھولیہ کی سرزمین کے 'دھوم دھام' والے 'شکیل ابن شرفؔ' کا تازہ شعری مجموعہ 'گل تر' دیکھا ہے تو دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

شکیلؔ ابن شرفؔ دھولیہ کے آسمان شاعری کے درخشاں ستارے ہیں۔ گذشتہ چار دہائیوں سے زمین سخن کو آسمان بنانے کی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز بیس سال کی عمر سے کیا۔ کم عمری میں والدین کے سائے سے محروم ہوئے۔ زمین سخت اور آسمان دور ہوتا گیا مگر حوصلہ سلامت رہا حساس طبیعت اور گداز دل شعر گوئی کا سبب بنا۔ اپنی محرومیوں، نامرادیوں اور مایوسیوں کے مقابلے کے لئے قلم کو تیشہ بنایا۔ مگر تیشے کو تلوار بننے نہ دیا بلکہ اسے 'گل تر' میں بدل دیا، آفرین ومرحبہ۔

آیئے اُس خوش فکر شاعر سے ملتے ہیں۔ اس وقت وہ دست بدعا ہیں۔ مالک ومولا سے عرض گزار ہیں۔

مجھ کو سوزِ میرؔ عطا کر یا مولا　　لفظوں کو تاثیر عطا کر دے مولا
مجھ کو وہ جاگیر عطا کر دے مولا　　راج کیا ہے جس پر میرؔ و غالبؔ نے

ان کا کلام اس دعا کی تاثیر سے ایسا مملو ہے کہ جی چاہتا ہے بس اسے پڑھتے چلیں۔ وہ غالبؔ کے معتقد اور میرؔ کے مقلد ہیں۔ 'چمن شاعری' کے ہر صفحہ پر 'گل تر' موجود ہے۔ یہ ہماری حیات مستعار کا مرقع ہے۔ جس کا چوکھا رنگ 'راستی' قرار پایا ہے، اس 'راستی' نے ان کی آواز کو بلند کیا ہے۔ اتنا بلند کہ وہ دور تک سنائی دینے لگی ہے۔ ان کے ہاں 'دیانت داری' ہے......فرد جماعت کی 'ظاہر داری' انھیں ایک آنکھ

نہیں بھاتی۔ وہ بڑی آسانی اور اعتماد کے ساتھ غزل کے حوالے سے اپنی 'واردات قلبی' کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہم ادب میں ہیں روایت کے طرف دار ضرور
روِش اپنی مگر اوروں سے جدا رکھی ہے

وقت نے چھین لیا حوصلۂ ضربِ کلیم
ورنہ ہر موڑ پہ آواز درا رکھی ہے

سماجی ناہمواریاں، آدمی کی ریشہ دوانیاں، سفّاکیاں ان سے کچھ چھپا نہیں ہے، وہ اپنے عہد کی بدحواسیوں پر وار کرتے ہیں اور ان کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ ملاحظہ کریں۔

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے کہ چل رہا ہے
سنبھل رہا ہے، پھسل رہا ہے کہ چل رہا ہے

جسے سہارا دیا تھا میں نے قدم قدم پر
وہ مجھ سے آگے نکل رہا ہے کہ چل رہا ہے

چل رہا ہے یہ سلسلہ اس خوبصورت شعر پر تمام ہوتا ہے۔

سخن طرازوں نے رنگ کیا کیا بدل کے دیکھے
بس اک فسونِ غزل رہا ہے کہ چل رہا ہے

ابن شرؔف کو جن باتوں کی وجہ سے 'شرف' حاصل ہے، ان کے 'نئے پن' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ہاں نئی بات، نیا انداز، نیا لہجہ، نیا رنگ و آہنگ ہے۔

وہ میرے دل میں مکیں آج بھی ہے
دل جہاں کل تھا وہیں آج بھی ہے

میرا اصرار بدستور وہی
اس کے ہونٹوں پہ نہیں آج بھی ہے

اپنی نظروں میں، میں کچھ اور بھی گھٹ جاتا ہوں
پیش کرتا ہے کوئی جب بھی بڑھا کر مجھ کو

وقت کی گردش سفاک سے ڈر لگتا ہے
کوزہ گر مجھ کو تیرے چاک سے ڈر لگتا ہے

ہم تو ہیں دھوپ کی شدت میں جھلستے ہوئے لوگ
لطف خس خانہ و برفاب کہاں جانتے ہیں

غالبؔ کی زمین میں ان کی غزل بھی متوجہ کرتی ہے۔ یہ گویا فلسفی شاعری کو فلسفیانہ انداز میں خراج پیش کرنے کا منفرد انداز ہے۔

کہنے سننے کو اب رہا کیا ہے
تم نے تو کہہ دیا تیرا کیا ہے

موت آتی ہے اچھے اچھوں کو　　　میں بھی مر جاؤں تو برا کیا ہے

ڈھوڈتے کیا ہو میری آنکھوں میں　　　آنسوؤں کے سوا دھرا کیا ہے

کلام شکیلؔ کا ایک اور وصف شعروں میں جا بجا طنز و ظرافت کی پھوار ہے۔ اس سے شاعر کی قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ ان کی ذہانت و فطانت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

گونج تھپڑ کی روح تک پہنچی　　　اس نے مارا تھا گال پر میرے

مری روداد سن کر قیس و فرہاد　　　گلے ملنے لگے استاد کر کے

کہا جنگل سے، جنگل کے مکیں نے　　　ڈرامت ذکر آدم زاد کر کے

ہم بھی تاویلوں سے دل بہلا رہے ہیں کیا کریں　　　اب سعادت مند بچے معجزے سے کم نہیں

تمہارے حسن کا چرچہ کروں گا پریوں میں　　　اگر کبھی سفر کوہِ قاف میں نے کیا

بھینس اس کی ہے، جس کی ہے لاٹھی　　　اور دنیا کا فلسفہ کیا ہے

ان کا احتجاجی لہجہ سرد نہیں ہے۔ وہ مزاحمت کرنا جانتے ہیں۔ حساس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد سے باخبر ہیں۔ انہیں گھٹن اوڑھنے سے انکار ہے۔ انھوں نے اپنے انداز کی چیخ کو نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ اس لئے کامیاب ہیں کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، وہ اظہار کی آزادی پر یقین رکھتے ہیں اور سو کی ایک بات وہ سچ سچ کہتے ہیں۔

مبارک، سلامت............

از: محمد رفیع انصاری

نشاطِ عشق کا شاعر......شکیلؔ ابن شرفؔ

اقبال برکی، مالیگاؤں

کہا جاتا ہے نیکی علم ہے لیکن علم نیکی نہیں ۔علم اکتسابی بھی ہوتا ہے اور وہبی بھی جب انسان اپنے اکتسابی اور وہبی علم کی بنیادوں پر شاہراہ حیات پر کوئی عمارت تعمیر کرتا ہے تو وہ اس کی فطری شرافت شرم وحیا، فیاضی، خداترسی اور نسل انسانی کے لئے بے پناہ جذبۂ ترّحم سے رنگین اور معمور ہوتی ہیں۔ یہ تمام خلقی صفات حسنہ عطائے ربانی ہوتی ہیں اور چاہے جس مسکن میں پناہ لیں وہاں سے اپنا جلوہ بکھیرتی رہتی ہیں، نیز بنی نوع انسان کے لئے فیض رسانی کا وسیلہ بھی بنتی رہتی ہیں اور اس کے لئے ہزار بہانے بھی تلاش کرتی رہتی ہیں۔خدائے پاک کی جانب سے ودیعت کردہ یہ صفات جس قلب مصفّٰی کو اپنا مرکز ومحور بناتی ہیں اگر اس میں روانی اور موزونیت بھی موجود ہو تو یہ ان سے مل کر دوآتشہ ہو جاتی ہیں۔ یہ اتصال انہیں زمان ومکان کی قیود وحدود سے آزاد کر کے نسل انسانی کی رہبری ورہنمائی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔اس خوبصورت دنیا اور اس میں آنے والے بے شمار فنکاروں کی زندگی اسی مضمون سے عبارت ہے۔

دھولیہ شہر سے تعلق رکھنے والے شکیلؔ ابن شرفؔ بھی ایک ایسے ہی فنکار ہیں اور شعر گوئی کا ملکہ رکھتے ہیں۔ان کی شاعری کے مطالعہ کے دوران ان کا ایک شعر بے ساختہ قلب ونظر کو اپنے حصار میں لے لیا اور دیر تک مسرور کئے رہا۔ان کا شعر ہے ۔

جب بھی تو میرے آس پاس رہا　　　چاند پہروں اداس اداس رہا

اس شعر نے طائران فکر کو نہ جانے کن کن مرغزاروں اور وادیوں کی سیر کروائی۔ میں تا دیر غور کرتا رہا کہ آخر شکیلؔ ابن شرفؔ نے حسن اور حسین کی تعریف کا یہ مغربی انداز آخر کہاں سے لیا ہوگا۔مغربی ادب میں طویل عرصے تک یہ رواج رہا ہے کہ خوبصورت اور خوبصورتی کی تعریف اس طرح سے کی جائے کہ نہ تو حسن اور نہ ہی حسین سے براہ راست تخاطب ہو اور نہ ہی بے باق بے حجابی و بے نقابی کا ارتکاب ہو۔مثال کے طور پر مشہور انگریزی شاعر اور ڈرامہ نویس شیکسپیئر ایک جگہ ایک حسین دوشیزہ کی تعریف کرتے ہوئے

اسے خبر دار کرتا ہے کہ وہ کبھی کسی باغ کی سیر کو جانے کی جرات نہ کرے ورنہ اس کا شوہر اسے طلاق دے دے گا۔

انگریزی کے اس بلیغ جملے کی تہہ میں اس نے دوشیزہ کے خوبصورت سرخ ہونٹوں کی تعریف کی تھی کہ اگر اتفاقاً وہ کسی باغ میں چلی گئی اور کوئی طوطا اس ہونٹوں کو سرخ سیب سمجھ کر منِقار زنی کر بیٹھے تو اس کے بعد کیا کیا بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شکیلؔ ابن شرفؔ نے وہی مغربی انداز اپنایا ہے۔ چاند اداس ہونے میں محبوب حسین ہونے کا جو قابل تعریف بیان ہے وہ لا جواب ہے ہو سکتا ہے کہ شکیلؔ ابن شرفؔ کا مذکورہ شعر اردو ادب کے قاری کو مومن خاں مومنؔ کا مشہور زمانہ شعر یاد دِلا دے کہ ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن مومنؔ اور شکیلؔ ابن شرف میں غالباً یہی بنیادی فرق ہے کہ اول الذکر کو محبوب کی ہم نشینی سے عشق ہے جب کہ مواخر الذکر کو بذات خود حسن سے عشق ہے۔ ان کا یہ شعر بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے کہ ؎

تمہارے حسن کا چرچہ کروں گا پریوں میں ۔۔۔۔۔ اگر کبھی سفر کوہِ قاف میں نے کیا

شکیلؔ بن شرفؔ روایت کے طرفدار ضرور ہیں لیکن پامال رہ گزاروں سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ وہ نئی راہوں کے متلاشی بھی ہیں اور جویا بھی۔ ان کے یہاں کہنے کو باتیں ہیں اور بات کہنے کا انداز بھی ان کے اشعار میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ ان کے یہاں دنیا داری بھی ہے اور دنیا سے بے رغبتی اور بے زاری بھی۔ ان کے یہاں جفا کشی بھی ہے اپنے خول میں مست رہنے کا قلندرانہ زمزمہ بھی۔ وہ اپنی کہہ کر دوسروں سے ترحم اور خود ترسی کے خواستگار نہیں ہوتے اور نہ ہی بے لگام انا پرستی و نخوت کے اسیر ہیں۔ ان کے یہاں کارزارِ حیات کے تجربات ہیں اور تجربات سے کشید کیا ہوا علم بھی ہے، جسے انہوں نے اپنے کلام میں خوشبو کی طرح بکھیر دیا ہے کہ ایک دنیا اس سے کسب فیض کرے۔

شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری کا سب سے دلکش پہلو اُن کا با حجاب، مہذب اور پاکیزہ عشق ہے جس میں شوخی بھی ہے اور سر مستی بھی۔ بے خودی بھی ہے اور خودداری بھی۔ شرارت اور بے باکی بھی ہے

اورشوریدہ سری اورفرزانگی بھی۔ان کے یہ عشقیہ اشعار،دورہی سہی،لیکن کشاں کشاں انھیں جگؔراورحسرؔت کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں۔دلیل اورنمونے کےطور پر ذیل کے چند اشعار دیکھ لیں۔مزید حظ وانبساط کی لئے ان کا مجموعۂ کلام دیکھا جاسکتا ہے۔

میں کہ اس دور میں امید وفا رکھتا ہوں	لوگ حیرت سے تکا کرتے ہیں صورت میری
کہاں جاتی میرے در پر جو بے چاری نہیں آتی	کسی کوبھی وفا کی نازبرداری نہیں آتی
کیسے کیسے لوگ آئے اوررخصت ہوگئے	اے شکیؔل اچھا نہیں اس درجہ اترانا ترا
اس نے جاتے ہوئے بھیجا ہے یہ پیغام شکیؔل	چھت پہ اب آکے پتنگیں نہ اڑانا سائیں
دھیرے دھیرے زخم بھرجاتے ہیں سب حالات کے	وقت سے بہتر عزیزوں کوئی بھی مرہم نہیں
سرخ روہوتے ہیں وہ کارگہہ ہستی میں	فیصلہ سوچ سمجھ کر جو کیا کرتے ہیں

اُمید ہے یہ مجموعہ کلام قبولیتِ دوام حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر اقبال برکؔی، مالیگاؤں

درونِ دِل کا شاعر......شکیلؔ ابنِ شرفؔ

ایڈوکیٹ عابداحمد خان

طالب ہاشمی (برہانپور)

ادب کی چوکھٹ پر اپنا سر جھکانے والے عاشق اوروں کے دل میں نہیں جھانکتے وہ صرف اپنے درونِ دل پر نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔تخلیقی طور پر ایسے باعمل فنکار اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کو بے کم و کاشت شعرلوازمات کے ساتھ پیش کرنے میں ایک گونہ راحت وانبساط سے سرشار ہوتے ہیں۔

ایک تخلیقی فنکار عمومی طور سے اپنی فکری نہج پر حقائق کو جذب وقبول کرنے کے گُر سے واقف ہوتا ہے۔وہ حیات وکائنات کے مسائل سے لبریز موضوعات کو اپنے تجربات کی انگیٹھی پر تیار کر اپنے اسلوب کا شیرہ نفیس انداز میں سادگی سے قارئین اور سامعین کے ذوق طلب کے پیمانے میں بھر کے پیش کرنے کو تسکین روح کی اس سعئ پیہم کو اپنا فرض اوّلین سمجھتا ہے۔میرے مطالعہ میں اس وقت شاعرِ موصوف شکیلؔ ابنِ شرفؔ کا غیر مطبوعہ مجموعۂ غزلیات گُلِ تر کا مسوّدہ ہے۔اس میں درج وہ اپنے ابتداءِ سخن میں مولائے کریم سے التجا کرتے ہیں۔

بجھا بجھا سا ایک دیا ہوں اردو کا　　　　تھوڑی سی تنویر عطا کر دے مولا

اس ملتجی انداز کے ساتھ فی زمانہ مذہبی انتشار کے پیشِ نظر بارگاہِ ایزدی میں دست بادعا اپنی نیک تمنا کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

جوڑ کے رکھے جو ملّت کو آپس میں　　　　پھر ایسی زنجیر عطا کر دے مولا

اس فکر رساں کی جولانی کے لئے شاعرِ موصوف احمدِ مجتبیٰؐ کی مدح کے توسط سے شکر الکم کے لئے طہارتِ قلوب کی خاطر والہانہ انداز میں یوں رطب السان ہوتے ہیں۔

روشن چاند ستاروں میں　　　　سورج میں سیّاروں میں

ندیوں میں کوہساروں میں　　　　تیرا جلوہ ہے ہر سو

یہاں اپنے استعاراتی لہجے میں علامتوں کا سہارا لے کر پیغمبر، ولی، قطب، ابدال، کی تمثیل پیش کی ہے۔ اور سورج سمان اجلے صاف دل کے خصوصی افراد کو افلاک کی گردش میں عزم محکم کی جہت کی وضاحت میں سبک رفتار ندیوں کی خوش خرامی اور کوہساروں کے مانند اٹل استقامت کی تلقین جتائی ہے، اسی کے پیش پیش خالقِ باری کی جلوہ سامانی اور بوقلمونی کے مظاہر کو عیاں کرنے کی حتی المقدر کوشش کی ہے۔

درونِ دِل کے اس شاعر کی نسبت سے میں اپنی اس مختصر تحریر کے ذریعے قارئین کرام کو سخن بینی کی دعوت دیتا ہوں۔ کیوں کہ وہ آپ کی چاہت کے خوگر ہیں۔ اسی لئے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں ؎

اگر کمال نہیں یہ تمہاری چاہت کا　　　میرے وجود میں کس نے بحال کی خوشبو

مقتدر اہل قلم اور سخن کے پار کھ تنقید نگاروں سے ادب کے بازار میں شاعرِ موصوف شکیلؔ ابنِ شرفؔ کے مجموعہ کلام کی قیمت آنکنے کی رغبت دلاتے ہوئے اس مذکورہ تحریر کے ساتھ اس شاعر کے چیدہ چیدہ اشعار بطورِ خاص درج ذیل ہیں ؎

خیال کرتے نہیں ہم کبھی مسافت کا　　　حصول منزل مقصد میں چلتے رہتے ہیں

ردِ عمل ضروری ہے لیکن رہے خیال　　　مغلوب کر نا دیں کہیں جذبات آپ کو

تم نے کوشش ہی نہیں کی آبیاری کے لئے　　　یہ شکایت مت کرو مٹی ہماری نم نہیں

طالبانِ علم کو سیراب کرتے جایئے　　　ہے یہ وہ دولت جو ہوتی بانٹنے سے کم نہیں

منہ تکیں آنے جانے والوں کا　　　اب ہمیں اور مشغلہ کیا ہے

شکیلؔ ابنِ شرفؔ کے ذخیرہ شعری میں سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سلیقہ ہے۔ جو سنجیدہ طبقے کا متاثر کرنے کا سامان رکھتے ہیں اس پر کسی سرقہ کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ان کا اپنا نجی اسلوب ہے اور اس کو میں ان کی کامیابی تصور کرتا ہوں۔

ایڈوکیٹ عابد احمد خان طالبؔ ہاشمی

صدر: راغبؔ ہاشمی فاؤنڈیشن، برہانپور۔ سیکریٹری: بزمِ راغبؔ برہانپور۔

آوازِ درا......شکیلؔ ابن شرفؔ

یٰسین اعظمی......مالیگاؤں

شاعری،افکارونظریات کے بیان کا وسیلہ،شعوروشعار کے اظہار کا سلیقہ،فردوقوم کی تعلیم وتربیت کا طریقہ،ذوق وشوق کی تسکین کا قرینہ،خواب وخواہش کی پیش کش کا انداز جداگانہ کا نام ہے۔

شکیلؔ ابن شرفؔ کی شاعری......فقط قافیہ پیمائی نہیں ،روایت کی طرف داری نہیں ،شہرت کی طلبگاری نہیں ،میرؔ وغالبؔ کی پیروی نہیں،وقت گزاری کی سبیل نہیں ،زخموں کی بے جا نمائش کا طریقہ نہیں، بلکہ ''گلِ تر'' کی شاعری تو بقول شکیلؔ ؎

وقت نے چھین لیا حوصلہ ضربِ کلیم ورنہ ہر موڑ پہ آواز درا رکھی ہے

شکیلؔ ابنِ شرفؔ کی آواز درا،وقت کی بانگ درا کی طرح بہت دیر تک ادب نوازوں کی سماعتوں کو احساس لطیف اور ذوق ادب کو تسکین ردیف عطا کرتی رہے گی''خوشبو کا بدن'' اور''مہکار''اس کا بین ثبوت ہے۔زیر نظر مجموعہ موصوف کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو'گل تر' کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔عاجزی وانکساری کے پیکر،حق وصداقت کے علمبردار،محبت والفت کے شیدائی،شیرینی گفتار کے مبلغ شکیلؔ ابنِ شرفؔ اس شعر کے خالق ہیں اوراس کی تعلیم کے مقلّد بھی۔

لہجے میں اگر تیرے حلاوت نہیں ہوگی ہرگز تیری باتوں کا اثر ہو نہ سکے گا

لہجے کی حلاوت،مزاج کی شیرینی نے ان کے حسنِ طلب کے غزلیا رنگ کو دعا سے سجادیا ہے ؎

میں کب تک خوابوں سے دل بہلاؤں گا خوابوں کو تعبیر عطا کر دے مولا

اے مالک لوح وقلم،''گلِ تر'' کے شاعر کوان کے خوابوں کی تعبیر عطا کردے۔شاعری کوان کے صالح افکارونظریات کی ترویج واشاعت کا وسیلہ بنادے۔ان کے ذوق وشوق کی تکمیل کا سامان بنادے ؎

مِرے خدا نے جسے چاہا ارجمند کیا تجھے بلند کیا مجھ کو سر بلند کیا

شاعر کی فکر وفن کی بلندی وپستی کا اندازہ اس کی شعری تخلیقات سے کیا جاتا ہے۔بقول شخصے،

شعر لفظ کا احترام سکھاتا ہے۔ بس لفظ کو برتنے کا سلیقہ چاہیئے۔ شکیلؔ ابنِ شرفؔ کے پاس لفظوں کو برتنے کا، احساسات کو اجاگر کرنے کا سلیقہ بھی ہے اور قرینہ بھی۔ ان کی شعری جبلّت استحسان سے پر ہے۔ وہ شاعری میں ایجاز و اختصار کے قائل ہیں۔ وہ اشارے اور کنائے میں اظہارِ حق کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ؎

حکم دے کر مری رہائی کا　　　دے نہ طعنہ شکستہ پائی کا
پوچھ مت وردِ آشنائی کا　　　اب زمانہ نہیں بھلائی کا

ملاحظہ فرمایئے ؎

میں مفلسی کی زد میں تھا سو محفل نشاط میں　　　میرے لئے الگ سے انتظام کر دیا گیا

کتنی خوبصورتی سے یادِ ماضی کے حوالے سے حقیقت کا انکشاف کر دیا۔ شکیلؔ ابنِ شرفؔ سادہ دل ہیں۔ صاف گو ہیں۔ حقیقت بیانی سے کام لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ؎

شہرت کا طلبگار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں　　　بکنے کو میں تیار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں
یاروں نے جو تصویر بنا ڈالی ہے میری　　　ایسا تو میں زِنہار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں

حالات سے خبر داری اور اس کا اشاراتی اسلوب نئی غزل کی پہچان ہے۔ کیا خوب اشاراتی اندازِ بیان ہے، دل کھول کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

میں وہاں جب تلک رہا موجود　　　پیر صاحب مراقبے میں رہے
وقت بدلا تو کھُل گئی آنکھیں　　　ہم بھی برسوں مغالطے میں رہے

اس مغالطے سے باہر آئے تو اپنے جذبوں کی آواز کو اور بلند کر دیا۔ غزل کو عشق، محبت، لب و رخسار، گُل و بلبل، صیاد و قفس سے نکال کر انسانی جذبوں سے رنگین کر دیا ؎

کیسے لکھوں قصیدۂ احباب　　　جھوٹ مجھ سے رقم نہیں ہوتا
ہو جہاں بات دوستی کی وہاں　　　ذکرِ دام و درم نہیں ہوتا

ایسا نہیں ہے کہ حضرتِ شکیلؔ حرفِ محبت سے آشنا نہیں۔ زلف و رخسار کے اسیر نہیں۔

الحمداللہ زندگی کو بھرپور طریقے سے جی رہے ہیں۔زمانے اور زندگی کی نیرنگی اور رنگارنگی دونوں کاحِظ اٹھار ہے ہیں۔مزاج کی شگفتگی نے دل کی کلی کو کھلایا تو بے ساختہ کہہ دیا۔

تم اپنی چھت پہ سرِ شام یوں نہ آیا کرو　　　تمام رات ستارے مچلتے رہتے ہیں

کبھی کہتے ہیں۔

ہو گیا اور شبِ ہجر کا کٹنا مشکل　　　چھپ گیا چاند تیری یاد دلا کر مجھ کو

موگرا، چمپا کلی،، جوہی گلاب　　　ڈال کر بیٹھے تھے ڈیرا اس کے سب

دیکھنے جیسی تھی صورت چاند کی　　　کررہے تھے ذکر تیرا سب کے سب

شکیلؔ ابنِ شرفؔ کی شاعری میں جہاں فرض کی ادائیگی کا احساس نظر آتا ہے وہیں حقیقت پسندی کا بے باکانہ اظہار بھی نمایاں ہے۔بشر ہیں،صبر شکر،عفو و درگذر کی صفات سے متّصف ہیں۔مگر بشری تقاضوں سے،انسانی نفسیات سے مجبور بھی ہیں۔بے اعتنائی،بے التفاتی،بے ثباتی اور بے وفائی پر جھنجھلا جاتے ہیں اور ردّعمل کا اظہار اعتدال کے ساتھ کرتے ہیں۔

زخم دیتے جائیں لیکن فکر مرہم بھی کریں　　　درد جب حد سے سوا ہو جائے تو کم بھی کریں

ہم سے الجھو گے تو پچھتانا پڑے گا ایک دن　　　درگذر جذبات کو تم بھی کرو ہم بھی کریں

بہت سیدھے سادے ہیں۔اسم بامسمّیٰ ہیں۔شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے،یہ بڑا اشرف ہے کہ سادگی سے تعارف دے کر دوستی کی پیش کش کرتے ہیں۔یقین کیجئے کہ جب میری ملاقات ہوئی اور ''گلِ تر'' کے حوالے سے گفتگو کا آغاز ہوا تو ان کی انکساری اس شعر کے مصداق رہی۔

انسان ہوں فرشتہ سمجھ کے نہ مجھ سے مل　　　مجھ میں برائیاں بھی ہیں اچھائیوں کے ساتھ

بے شک!جس طرح انسان میں خیر وشر،اچھائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں اسی طرح کلام میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔جو صفت غالب ہوتی ہے نظر آتی ہے۔''گلِ تر'' اتنی ساری خوبیوں سے مزین ہے کہ خامیاں چھپ گئی ہیں۔

میرے تحقیقی کاموں کے نگراں ورہنما پروفیسر (ڈاکٹر) محمد سلیم انصاری صاحب (ریسرچ گائڈ، نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی جلگاؤں)' نے بطور نصیحت کہا تھا۔ "تخلیق فنّی خوبیوں کا گلدستہ ہوتی ہے اس میں کہیں کہیں معائیب کے خار بھی ہوتے ہیں۔ گلوں سے پیار کروگے تو خوشبو کا احساس زندگی کو مہکائے رکھے گا اور کانٹوں سے کھیلنے کی کوشش کروگے تو انگلیوں کو زخمی کرلوگے"۔

میں خوشبو کا تمنائی ہوں، کانٹوں سے الجھنا میری عادت نہیں۔ "گلِ تر" کا یہ شعر میرے لئے رہنما ہوگا۔

شکیلؔ شعر تیرے سن کے سب مہکنے لگے   یہ تیرے لہجے میں ہے کس کمال کی خوشبو

مجھے یقین ہے کہ "گلِ تر" مغربی خاندیش میں اردو شاعری کا اہم انتخاب ہوگا۔ انشاءاللہ۔

اعظمی محمد یٰسین محمد عمر (مالیگاؤں)

ریسرچ اسکالر

کویتری بہنابائی چودھری، اتر مہاراشٹر یونیورسٹی،

جلگاؤں۔

aazmijks@gmail.com

9226120190,8208169206

''اللہ ھوٗ''

میں نے دیکھا ہے ہر سوٗ ہر جانب ہے تو ہی تو
کلیوں میں مہکار تِری پھولوں میں تیری خوشبو

بادِ سحر ہمراز تِری جھرنوں میں آواز تِری
ہر شئے ہے غماز تِری ہر شئے میں ہے تیری بوٗ

روشن چاند ستاروں میں سورج میں سیّاروں میں
ندیوں میں کہساروں میں تیرا جلوہ ہے ہر سوٗ

صبح کی اجلی تھالی میں شام شفق کی لالی میں
کھیتوں کی ہریالی میں پاتا ہوں تجھ کو ہر سوٗ

تخت ترا ہے تاج ترا سارے جگ پر راج ترا
ہر کوئی محتاج ترا سب کو دینے والا توٗ

ہے یہ شکیلؔ ایمان مرا وہ رکھتا ہے دھیان مرا
کیوں ہو گا نقصان مرا لاکھ کرے کوئی جادو

نعت

جب آپؐ پہنچے عرش پر آئی صدا شکراً لکم
صلی علیٰ صلی علیٰ صلی علیٰ شکراً لکم

رخصت ہوئیں تاریکیاں روشن ہوا سارا جہاں
نورالھدیٰ شکراً لکم شمس الضحیٰ شکراً لکم

تھے بے سلیقہ سب کے سب سکھلا دیا جینے کا ڈھب
امّی لقب عالی نسب خیرالوریٰ شکراً لکم

نظریں جھکائے با ادب پہنچا درِ اقدس پہ جب
ہونٹوں پہ میرے آ گیا بے ساختہ شکراً لکم

کرتا ہوں میں شام و سحر جو مدحتِ خیرالبشرؐ
احسان ہے مجھ پر ترا فِکرِ رسا شکراً لکم

جب فتح مکّہ ہو گیا دی آپؐ نے سب کو اماں
ہر کوئی یہ کہنے لگا یا مصطفیٰ شکراً لکم

غزل

کیا کہیں لُطف و عنایات کسے کہتے ہیں
پوچھئے ہم سے کہ صدمات کسے کہتے ہیں

اپنے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں
کیا بتائیں کہ غمِ ذات کسے کہتے ہیں

کردیا غرق مجھے تم نے سہارا دے کر
یہ عنایت ہے تو پھر گھات کسے کہتے ہیں

حوصلہ ہارنا فطرت میں نہیں ہے شامل
ہم کو معلوم نہیں مات کسے کہتے ہیں

ہم تغافل کی شکایت نہیں کرتے لیکن
یہ بتاؤ کہ عنایات کسے کہتے ہیں

آپ نے دِل کو کھلونے کی طرح توڑ دیا
آپ کیا جانے کہ جذبات کسے کہتے ہیں

کون در پردہ ترے عشق میں ڈوبا ہے شکیلؔ
لوگ جاجا کے تری بات کسے کہتے ہیں

غزل

کیوں تجھے فکرِ خودنمائی ہے
باز آ اِس میں جگ ہنسائی ہے

کل جو منسوب مِرے نام سے تھی
آج وہ روشنی پرائی ہے

درد و غم رنج و کلفت و آلام
میری اِن سب سے آشنائی ہے

لو سنبھالو مِرے ادھورے خواب
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

ہیں گناہوں سے دامن آلودہ
پھر بھی دعوائے پارسائی ہے

آئینہ دم بخود ہے جلوؤں سے
خوب اندازِ دِلرُبائی ہے

کیا کریں آرزو کسی کی شکیلؔ
کب خوشی ہم کو راس آئی ہے

غزل

اِک مسلسل عذاب ہوتا ہے
خواب کہنے کو خواب ہوتا ہے

اِن اندھیروں کو کون سمجھائے
آفتاب آفتاب ہوتا ہے

سب سے سب متفق نہیں ہوتے
سب کا اپنا حساب ہوتا ہے

عشق کب دیکھتا ہے سُود و زیاں
اُس کا اپنا نصاب ہوتا ہے

کوئی خوبی نظر نہیں آتی
جب تعلق خراب ہوتا ہے

ہم گزرتے ہیں حشر سے ہر دِن
ہر گھڑی احتساب ہوتا ہے
بار بار اُس کو ٹوکتے ہو شکیلؔ
اِس طرح دِل خراب ہوتا ہے

☆

بول جو بولنا ہے پر یہ بتا
تیرے منہ میں زبان کس کی ہے

☆

کیا کہا تم مجھے بھلا دو گے
واہ یہ تو کمال ہی ہوگا

☆

یار کتنے انا پرست ہو تم
نام لکھنے میں کیا قباحت تھی

غزل

وہ جھوٹ کہہ کے صاحبِ کردار ہو گیا
میں نے جو سچ کہا تو گنہگار ہو گیا

تھا شاخ پر گُلاب بڑی شان سے مگر
جوُڑے میں ترِے اور طرحدار ہو گیا

آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا میں جس کے واسطے
وہ شخص میری راہ کی دیوار ہو گیا

اُس پر کسی بھی بات کا ہوتا نہیں اثر
دیوانہ اِس لحاظ سے ہُشیار ہو گیا

گُم سم دِکھائی دیتے ہو تم آج کل شکیلؔ
سچ کہنا کیا کسی سے تمہیں پیار ہو گیا

ہجر یوُنہی تو میسّر نہیں ہوتا لوگو
دل لگایا تو یہ آزار کمایا ہم نے

غزل

پیار کرتے تھے پیار کرتے رہے
ہم یہی کاروبار کرتے رہے

غیر پر انحصار کرتے رہے
ختم اپنا وقار کرتے رہے

ہم نے بدلہ کبھی لِیا ہی نہیں
یہ خطا بار بار کرتے رہے

ہم کو رکھنا تھا دوستوں کا حساب
زخم اپنے شمار کرتے رہے

بات تھی انتظار کی سو ہم
عمر بھر انتظار کرتے رہے

اُس کے دِل میں جگہ بنا نہ سکے
ہم عبث خود کو خوار کرتے رہے

لوگ دیتے رہے فریب شکیلؔ
اور ہم اعتبار کرتے رہے

غزل

ہم اُن کی بزم میں لوگوں کو کم دِکھائی دیے
کسی نے ہم کو پُکارا تو ہم دِکھائی دیے

جو سرفراز تھے سر اُن کے خم دِکھائی دیے
جہاں جہاں ترے نقشِ قدم دِکھائی دیے

وہ جس گلی میں ہمیں روکتے تھے جانے سے
اُسی گلی میں کئی محترم دِکھائی دیے

سو اپنے دِل میں انھیں بھی پناہ دینی پڑی
خوشی کو ڈھونڈ رہے تھے غم دِکھائی دیے

پتا چلا کہ دِکھاوا تھا اور کچھ بھی نہیں
قدم قدم پہ جو اہلِ کرم دِکھائی دیے

گِنا رہے تھے فضیلت جو مِل کے رہنے کی
ستیزہ کار ، وہ سارے بہم دِکھائی دیے

یہ اور بات مخاطب نہیں ہوئے ہم سے
یہی بہت ہے کہ وہ کم سے کم دِکھائی دیے

سب اپنے آپ کو افضل بتا رہے تھے شکیلؔ
عجیب حال میں اہلِ حرم دِکھائی دیے

☆

شہرت کے لئے آج دکھاوا ہے ضروری
سچ کہتے ہو تم مجھ سے مگر ہو نہ سکے گا

لہجے میں اگر تیرے حلاوت نہیں ہوگی
ہرگز تیری باتوں کا اثر ہو نہ سکے گا

ہم نے ایک شخص سے محبت کی
اور پھر عمر بھر اسی کے رہے

غزل

دیکھنا کیا کوئی بچنے کی بھی جا رکھّی ہے
میری تصویر جو یاروں نے بنا رکھّی ہے

وہ جہاں بھی رہے آباد رہے شاد رہے
میں نے ہونٹوں پہ یہی ایک دعا رکھّی ہے

کیا کریں اب کوئی مصرف ہی نہیں ہے اسکا
اک طرف باندھ کے تہذیب وفا رکھّی ہے

مجھ کو لگتا تھا نہیں ہے کوئی میرا لیکن
ہر کسی نے میری تصویر سجا رکھّی ہے

پھینک دے اس کو اگر عافیت اپنی ہے عزیز
سر پہ گٹھری جو گناہوں کی اٹھا رکھّی ہے

ہم ادب میں ہیں روایت کے طرف دار ضرور
روِش اپنی مگر اوروں سے جدا رکھّی ہے

وقت نے چھین لیا حوصلۂ ضربِ کلیم
ورنہ ہر موڑ پہ آواز دِرا رکھّی ہے

نہ تو انکار ہی کرتا ہے نہ اقرار شکیلؔ
جان اس نے مِری سولی پہ چڑھا رکھّی ہے

☆

عید آتی ہے چلی جاتی ہے
لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں

☆

یہ بتا ذکرِ غمِ ذات کبھی میں کیا
شکوۂ گردشِ حالات کبھی میں نے کیا

جیسا برتاؤ میرے ساتھ ہے تیرا اے دوست
ویسا برتاؤ تیرے ساتھ کبھی میں نے کیا

غزل

جو دوسروں کے اشاروں پہ چلتے رہتے ہیں
وہ عمر بھر کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں

جو تند و تیز ہواؤں میں جلتے رہتے ہیں
وہی چراغ اندھیروں کو کھلتے رہتے ہیں

یہ جانتا ہوں مری دسترس میں کچھ بھی نہیں
مگر وہ خواب جو آنکھوں میں پلتے رہتے ہیں

تم اپنی چھت پہ سرِشام یوں نہ آیا کرو
تمام رات ستارے مچلتے رہتے ہیں

کسی کی آنکھوں میں ہوتی ہے زندگی کی چمک
کسی کی آنکھ سے چشمے ابلتے رہتے ہیں

خیال کرتے نہیں ہم کبھی مسافت کا
حصولِ منزلِ مقصد میں چلتے رہتے ہیں

لبوں پہ اپنے تبسّم تو میں سجالوں گا
مگر جو آنکھوں سے آنسو نکلتے رہتے ہیں
ذرا بتاؤ تو کس کس کو مات دوگے شکیلؔ
بساطِ وقت پہ مہرے بدلتے رہتے ہیں

☆

جانے والے تجھے خبر بھی ہے
کس اذیت میں مبتلا ہوں میں

☆

اپنے پیروں پہ کھڑے ہو گئے دھیرے دھیرے
اب نہیں ہے میرے بچوں کو ضرورت میری
میں کہ اس دور میں امید وفا رکھتا ہوں
لوگ حیرت سے تکا کرتے ہیں صورت میری

غزل

یہ نہیں یا وہ نہیں یا تم نہیں یا ہم نہیں
کون اس دنیا میں ایسا ہے کہ جس کو غم نہیں

ایک اِک تصویر ہے محفوظ اب تک ہوٗبہوٗ
اے تصوّر تجھ سے بہتر کوئی بھی البم نہیں

فائدہ تکرار سے کیا ہوگا جا نے دیجیئے
ہم سے واقف تم نہیں ہو تم سے واقف ہم نہیں

ہم بھی تاویلوں سے دل بہلا رہے ہیں کیا کریں
اب سعادت مند بچے معجزے سے کم نہیں

چاہے جتنی بھی گھما کر بات کی جائے شکیلؔ
مسکرا کر صاف کہہ دیتے ہیں وہ ہردم 'نہیں'

چلو ان کی گلی ہی دیکھ آئیں
طبیعت کچھ دنوں سے مضمحل ہے

غزل

حکم دے کر مری رہائی کا
دے نہ طعنہ شکستہ پائی کا

پوچھ مت درد آشنائی کا
اب زمانہ نہیں بھلائی کا

شوق رکھتا ہے خود نمائی کا
غم کہاں اسکو جگ ہنسائی کا

بات کرتا ہے انکساری کی
دل میں جذبہ ہے خود نمائی کا

وہ تو ہر اک سے ہنس کے ملتا ہے
مت بناؤ پہاڑ رائی کا

لے کر آؤں گا شہر سے کنگن
ناپ دے دیجیئے کلائی کا

شاخ گل بھی جواب دے نہ سکے
تیرے اندازِ دلربائی کا

کیوں گلے مل رہا ہے بڑھ بڑھ کر
کیا ارادہ ہے میرے بھائی کا

کوئی پہچانتا کسی کو نہیں
صرف دعویٰ ہے آشنائی کا

☆

آج جی بھر کے دیکھ لو ہم کو
کیا خبر پھر کبھی ملیں نہ ملیں

☆

شہرت کا طلبگار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں
بکنے کو میں تیار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں
یاروں نے جو تصویر بنا ڈالی ہے میری
ایسا تو میں زنہار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں

غزل

لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں اپنی نادانی سے
میں تو اب بھی مل جاتا ہوں یاروں کو آسانی سے

پار وہ کر لیتے ہیں ہر اک مشکل کو آسانی سے
کام لیا کرتے ہیں ہردم جذبوں کی جولانی سے

اتنا علم کہاں سے سیکھا پوچھا جو اک گیانی سے
اس نے ہنس کر یہ بتلایا لوگوں کی نادانی سے

جب بھی آئینہ دیکھو گے میری یاد آجائے گی
چاہ کے بھی تم بھول نہ پاؤ گے مجھ کو آسانی سے

یہ میں ہوں یا میرے جیسا اور کوئی ہے کیا معلوم
میری جانب دیکھ رہا ہے آئینہ حیرانی سے

میری نگاہوں کی گرمی جب ان کے رخ پر پڑتی ہے
اور زیادہ لگتے ہیں وہ نورانی نورانی سے

خون کے قطرے بھیج رہا ہے اشکوں کی ترسیل کے بعد
دل کو وحشت سی ہوتی ہے آنکھوں کی ویرانی سے
اس کو نصیحت کرنا بھی ہے تضیعِ اوقات شکیلؔ
چپ ہو جانا بات سنے جب کوئی تری بے دھیانی سے

جو مجھ کو چھوڑ کے نکلا تھا بیچ دھارے میں
وہ اب بھی سوچتا رہتا ہے میرے بارے میں

قسمت میں جو لکھا تھا ملا اور بھی کچھ مانگ
اے پیکرِ تسلیم و رضا اور بھی کچھ مانگ
ہو سکتا ہے سب کچھ تجھے دے کر وہ یہ بولیں
جاتا ہے کہاں لوٹ کے آ اور بھی کچھ مانگ

غزل

کس سے ملتے ہیں کہاں جاتے ہیں کیا کرتے ہیں
وسوسے دل میں یہ رہ رہ کے اٹھا کرتے ہیں

فرق کرتے ہیں کہاں اپنے پرائے میں کبھی
جو بھلے ہوتے ہیں وہ سب کا بھلا کرتے ہیں

سرخرو ہوتے ہیں وہ کارِ گہہ ہستی میں
فیصلہ سوچ سمجھ کر جو کیا کرتے ہیں

دیکھ کر مجھ کو بدل جاتے ہیں ان کے تیور
دوسروں سے تو وہ ہنس ہنس کے ملا کرتے ہیں

تیرے دیوانے گزر جاتے ہیں ہنستے ہنستے
ہوشمندوں کے جہاں ہوش اڑا کرتے ہیں

دیکھنے والوں کی کیا بات کہیں وہ خود بھی
آئینہ دیکھ کے دل تھام لیا کرتے ہیں

کیا عزیزوں سے ہمیں کوئی شکایت ہو شکیلؔ
دشمنوں کے لئے بھی ہم تو دعا کرتے ہیں

غزل

چارہ گر تیری توجہ مجھے درکار نہیں
کارگر جس پہ دوا ہو یہ وہ آزار نہیں

وصل کے ذکر پہ کہتا ہے تو ہر بار نہیں
پھر بھی دیوانہ تیرا جان سے بیزار نہیں

واعظِ تنگ نظر مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
ہوں گنہگار مگر تیرا گنہگار نہیں

میں یہاں وقت گزاری کے لیے آیا ہوں
تیری دنیا سے مجھے کوئی سروکار نہیں

میں نے سچ کہہ کے دُکھایا ہے بہت دل انکا
بے سبب لوگ مِرے دَرپئے آزار نہیں

☆

تھوڑی تکلیف اٹھا لیتا تو کیا ہو جاتا
کم سے کم حق تو بزرگوں کا ادا ہو جاتا

غزل

جب بھی تو میرے آس پاس رہا
چاند پہروں اداس اداس رہا

شعر کہنے میں لطف آتا تھا
جب تلک وہ ہمارے پاس رہا

آ گیا راس ہجر کا موسم
پہلے پہلے تو دل اداس رہا

دکھ تو یہ ہے کہ سب کی نظروں میں
میں اکیلا ہی ناسپاس رہا

پھر مصائب کا ہوگیا عادی
کچھ دنوں تک میں بد حواس رہا

ہر کسی نے کیا نظر انداز
کب کوئی میرا غم شناس رہا

کیا پتا اس نے کیا جواب دیا
میں تو بس محوِ اِلتماس رہا

سب کو سیراب کردیا اس نے
صرف خالی میرا گلاس رہا
ہم نشینوں کی شاعری میں شکیلؔ
میرے شعروں کا انعکاس رہا

☆

جان میری نکل گئی جیسے
اس نے جس دم کہا خدا حافظ

☆

زیادہ دیر تک کوئی اکیلا رہ نہیں پاتا
ہر اک دریا سمندر کا دہانہ ڈھونڈ لیتا ہے

غزل

کڑوی نہیں لگے گی مری بات آپ کو
معلوم ہوں گے جب میرے حالات آپ کو

کس کس نے کیسے کیسے دیئے زخم آج تک
دکھلاؤں گا میں سارے نشانات آپ کو

ردِّعمل ضروری ہے لیکن رہے خیال
مغلوب کر نہ دیں کہیں جذبات آپ کو

لگتا ہے آپ بھول گئے ہیں مجھے مگر
میں یاد کرتا رہتا ہوں دن رات آپ کو

یہ ناقدانِ شہر کو کیا ہوگیا شکیلؔ
منسوب کر رہے ہیں میرے ساتھ آپ کو

☆

آٹھ دس سال کھلا یا ہے کما کر اس نے
اپنے ماں باپ پہ احسان بہت ہے اس کا

غزل

آدمی اپنے دائرے میں رہے
سب سے مل کر رہے مزے میں رہے

متن میں یا کہ حاشیئے میں رہے
ہم بہر حال تذکرے میں رہے

ہر کسی سے بنائے رکھتا ہے
کیوں نہ وہ شخص فائدے میں رہے

مجھ کو تکلیف دینے والے جا
تو جہاں بھی رہے مزے میں رہے

میں وہاں جب تلک رہا موجود
پیر صاحب مراقبے میں رہے

وقت بدلا تو کھُل گئیں آنکھیں
ہم بھی برسوں مغالطے میں رہے

اب کریں دھوپ کی شکایت کیا
زندگی بھر تو ہم کھلے میں رہے

گردشِ وقت تلملاتی رہی
ہم تو ہر حال میں مزے میں رہے

ایک لاٹھی سے سب کو ہانکتے ہو
فرق کچھ تو بھلے برے میں رہے

قدر ہیرے کی کم نہیں ہوتی
قصر میں یا کہ جھونپڑے میں رہے

اس نے کیا کیا کہا نہیں معلوم
ہم تو بس اسکو دیکھنے میں رہے

ہم نے حالات کا گلہ نہ کیا
چاہے جیسے رہے مزے میں رہے

حشر کے دن یہ آرزو ہے شکیلؔ
اُن کی تختی مِرے گلے میں رہے

میری ٹوٹی ہوئی کشتی کو تعجب سے نہ دیکھ
کتنے طوفانوں کا منہ موڑ چکی ہے اب تک

غزل

کہنے سننے کو اب رہا کیا ہے
تم نے تو کہہ دیا ترا کیا ہے

موت آتی ہے اچھے اچھوں کو
میں بھی مرجاؤں تو برا کیا ہے

منہ تکیں آنے جانے والوں کا
اب ہمیں اور مشغلہ کیا ہے

دل کو اب چین ہی نہیں ملتا
تیری آنکھوں نے کہہ دیا کیا ہے

بھینس اس کی ہے جس کی ہے لاٹھی
اور دنیا کا فلسفہ کیا ہے

اس کی آنکھوں کا سحر طاری ہے
ہم سے مت پوچھیے نشہ کیا ہے

ڈھونڈتے کیا ہو میری آنکھوں میں
آنسوؤں کے سوا دھرا کیا ہے

غزل

ایک جانب ہے کنواں ایک طرف کھائی ہے
زندگی مجھ کو کہاں کھینچ کے لے آئی ہے

کل چلی جائے گی یہ آج اگر آئی ہے
دیکھ دولت پہ نہ اِترا کہ یہ ہرجائی ہے

میری شہرت کے سبب پائی ہے تو نے شہرت
میری رُسوائی سراسر تیری رُسوائی ہے

شور سنتے تھے بہت اس کی غزل کا لیکن
شاعری کیا ہے فقط قافیہ پیمائی ہے

گھر کے آنگن میں مہکتی ہیں یہ پھولوں کی طرح
بیٹیاں معصوم ہوتی ہیں فرشتوں کی طرح
یہ ہمارے حق میں ہیں اللہ کی رحمت شکیلؔ
ہم نہیں ان کو سمجھتے بوجھ اوروں کی طرح

غزل

آس بھی ٹوٹی نہیں ہے وسوسہ بھی کم نہیں
ہاں مگر اب اضطرابِ دِل کا وہ عالم نہیں

دینے والے شکریہ ویسے تو یہ بھی کم نہیں
میں نے مانگا تھا سمندر قطرۂ شبنم نہیں

جتنی ملتی ہے سہولت اتنی بڑھتی ہے طلب
مطمئن ہو جائے ہرگز فطرتِ آدم نہیں

کیسے لوٹیں گے بھلا ہم اپنی ماضی کی طرف
دل میں اب جذبہ نہیں ہے ہاتھ میں پرچم نہیں

لازم و ملزوم ہیں ایک دوسرے کے واسطے
ہم نہیں تو تم نہیں جو تم نہیں تو ہم نہیں

دھیرے دھیرے زخم بھرتے جائیں گے حالات کے
وقت سے بہتر عزیزو کوئی بھی مرہم نہیں

عمر بھر رونا پڑے گا دل لگاؤ گے اگر
عشق ایسا زخم ہے جس کا کوئی مرہم نہیں

تم نے کوشش ہی نہیں کی آبیاری کے لئے
یہ شکایت مت کرو مٹی ہمای نم نہیں

تم نمک پاشی کرو گے تو مزہ آ جائے گا
زخم وہ رکھتا ہوں جو منت کشِ مرہم نہیں

مدتوں رویا کریں گے یاد کر کر کے شکیلؔ
بھول جائیں گے ہمیں احباب ایسے ہم نہیں

☆☆☆

زندگی میں بھی تیرا ساتھ کہاں تک دوں گا
اچھے اچھوں نے تجھے بیچ بھنور میں چھوڑا

پاس جو کچھ تھا ابو بکرؓ کے سب لے آئے
بال بچوں کے لئے کچھ بھی نہ گھر میں چھوڑا

غزل

یہ خیال آتا ہے تنہائی میں اکثر مجھ کو
جی رہا ہوگا وہ کس طرح بھلا کر مجھ کو

تیرے کوچہ کی سکونت ہو میسر مجھ کو
لوگ بیٹھا ہوا دیکھیں تیرے در پر مجھ کو

ان کے ہمراہ میں جاؤں بھی تو کیسے جاؤں
سب نظر آتے ہیں یوسفؑ کے برادر مجھ کو

ٹھوکریں کھا کے سنبھلنے کا ہنر آیا ہے
کیوں نہ محبوب ہوں پھر راہ کے پتھر مجھ کو

تنگ دستی تھی مگر لوگ کشادہ دِل تھے
یاد آتے ہیں وہ ٹوٹے ہوئے چھپر مجھ کو

اس لئے میں کبھی غافل نہیں ہونے پاتا
وقت رہ رہ کے لگا دیتا ہے ٹھوکر مجھ کو

اس کی رحمت ہے زیادہ کہ خطائیں میری
مت دکھاؤ میرے اعمال کا دفتر مجھ کو

میں نہ سوؤں تو اسے نیند کہاں آتی ہے
میری ماں سوتی ہے ہر روز سلا کر مجھ کو

اس لئے دیکھ کے دشمن کو اکڑ جاتا ہوں
انکساری سے سمجھ لے نہ وہ کمتر مجھ کو

یوں نہ ہو ڈھونڈنی پڑ جائے تجھے راہِ فرار
چھیڑنا بھائی مِرے سوچ سمجھ کر مجھ کو

اپنی نظروں میں میں کچھ اور بھی گھٹ جاتا ہوں
پیش کرتا ہے کوئی جب بھی بڑھا کر مجھ کو

ہوگیا اور شبِ ہجر کا کٹنا مشکل
چھپ گیا چاند تیری یاد دلا کر مجھ کو

اے جنوں کون سی منزل ہے یہ بتلا تو سہی
آسماں بھی نظر آتا ہے زمیں پر مجھ کو

اے شکیلؔ ان کی گلی ہے تیری جاگیر نہیں
کس لئے ٹوکتا رہتا ہے تو اکثر مجھ کو

غزل

کہاں جاتے ہو یوں برباد کرکے
بہت روؤگے ہم کو یاد کرکے

جنہیں ہم شاد رکھنا چاہتے ہیں
چلے جاتے ہیں وہ ناشاد کرکے

کہا جنگل سے جنگل کے مکیں نے
ڈرامت ذکرِ آدم زاد کرکے

خدا کا قہر ہو سکتا ہے نازل
نہ جتلانا کبھی امداد کرکے

مری رؤداد سن کر قیس و فرہاد
گلے ملنے لگے استاد کرکے

وہی بے رغبتی بے اعتنائی
ملا کیا نالہ و فریاد کرکے

غزل

وہ عقیدت سے دیکھتے ہیں مجھے
لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں مجھے

میں انہیں ڈھونڈتا ہوں گلیوں میں
اور وہ چھت سے دیکھتے ہیں مجھے

کر کے چربہ مرے ہی شعروں کا
وہ رعونت سے دیکھتے ہیں مجھے

ان کی اوقات جانتا ہوں میں
جو حقارت سے دیکھتے ہیں مجھے

دل کی حالت عجیب ہوتی ہے
جب وہ چاہت سے دیکھتے ہیں مجھے

تم میرے ساتھ تھوڑی دور چلو
لوگ حسرت سے دیکھتے ہیں مجھے

ناز ہے تجھ پہ کیوں کہ لوگ شکیلؔ
تیری نسبت سے دیکھتے ہیں مجھے

غزل

لوگ ہنستے ہیں حال پر میرے
جشن سا ہے زوال پر میرے

گونج تھپّڑ کی روح تک پہنچی
اس نے مارا تھا گال پر میرے

راہ تکتے ہیں میرے مرنے کی
ہے نظر سب کی مال پر میرے

دوستو جاؤ اپنا کام کرو
چھوڑ دو مجھ کو حال پر میرے

ہر کوئی قید کرنا چاہتا ہے
ہوگئے ہے وبال پر میرے

اس میں میرا کوئی کمال نہیں
مت حسد کر کمال پر میرے

میں نے مانگا جو اس کا ہاتھ شکیلؔ
ہنس پڑا وہ سوال پر میرے

غزل

وقت کی گردش سفاک سے ڈر لگتا ہے
کوزہ گر مجھ کو تیرے چاک سے ڈر لگتا ہے

یہ جلا دے نہ کہیں میرے ہی گھر آنگن کو
مجھ کو اپنے خس و خاشاک سے ڈر لگتا ہے

سوچتا ہوں میں اکیلا نہ کہیں ہو جاؤں
مجھ کو اب خود بھی میری دھاک سے ڈر لگتا ہے

سادہ لوحی میں کئی بار لٹے ہیں ہم لوگ
اب تیری فطرتِ چالاک سے ڈر لگتا ہے

کسی طوفان کو خاطر میں نہیں لاتا میں
بس تیرے دیدہ نمناک سے ڈر لگتا ہے

مدعا دل کا تو میں کب کا بیاں کر دیتا
پر تری چشم غضبناک سے ڈر لگتا ہے

غزل

ایک ہی شخص تھا خوابوں جیسا
وہ ملا بھی تو سرابوں جیسا

اس کی آنکھیں تھی ستارہ جیسی
اس کا چہرا تھا گلابوں جیسا

میں اسے کیسے بھلاؤں گا کہ وہ
یاد ہے مجھ کو نصابوں جیسا

پوچھ صحرا سے کہ دیکھا ہے کبھی
حال ہم خانہ خرابوں جیسا

پھر رہا تھا وہ فقیروں کی طرح
اس کا لہجہ تھا نوابوں جیسا

وہ حیا تھی کہ محبت تھی شکیلؔ
کچھ تھا چہرے پہ حجابوں جیسا

غزل

اس نے لکھا تھا سُنوں گی نہ بہانہ سائیں
اب کے ساون میں ہے بس آپ کو آنا سائیں

اس نے لکھا تھا بہت دیر ہوئی جاتی ہے
قدر کھو دے نہ کہیں آئینہ خانہ سائیں

گھر کے حالات بتاؤں گی بھلا کس کس کو
طعنہ زن رہتا ہے ہر وقت زمانہ سائیں

رشتہ داروں سے بھی ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کب تلک یونہی بناؤں گی بہانا سائیں

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہا تھا اس نے
شوق سے جاؤ مگر لوٹ کے آنا سائیں

جس جگہ چھاؤں نظر آئی وہیں بیٹھ گئے
ہم فقیروں کا کہاں کوئی ٹھکانا سائیں

اپنی روٗداد محبت نہ سناؤ ہم کو
یاد آجائے گا پھر زخم پرانا سائیں

اس نے جاتے ہوئے بھیجا ہے یہ پیغام شکیلؔ
چھت پہ اب آکے پتنگیں نہ اڑانا سائیں

☆

ہاتھوں میں وقت کے بھی نہیں ہے عنانِ وقت
رکتا نہیں کسی کے لئے کاروانِ وقت

☆

میں کہ اس دَور میں امید وفا رکھتا ہوں
لوگ حیرت سے تکا کرتے ہیں صورت میری
اپنے پیروں پہ کھڑے ہوگئے دھیرے دھیرے
اب نہیں ہے مِرے بچوں کو ضرورت میری

غزل

ذرا طوفان سے پوچھو اسے کیسا لگے گا
کنا رے پر سفینہ جب ہمارا آ لگے گا

جلو میں اسکے رہتے ہیں ہمیشہ چاند تارے
بظاہر وہ بہت تنہا بہت تنہا لگے گا

خدا کے فضل سے میں کامرانی پا چکا ہوں
نہیں معلوم اب کس کس کو یہ اچھا لگے گا

ڈراتے ہو جلاتے ہو ستاتے ہو ہمیشہ
نہ ہوں گے ہم تو بتلاؤ تمہیں کیسا لگے گا

رہو خوش فہمیوں میں مبتلا اچھا یہی ہے
اگر آئینہ دیکھو گے تمہیں جھٹکا لگے گا

شکیلؔ ابن شرفؔ ہر ایک پہ کھلتا نہیں ہے
ہے قد آور مگر تم کو بہت چھوٹا لگے گا

غزل

جواز اپنی خطا کا تلاش کرتا ہے
بشر ہمیشہ بہانہ تلاش کرتا ہے

وہ اُس کو پاتا ہے اپنے رگِ گلو کے قریب
خدا کو جب کوئی بندہ تلاش کرتا ہے

نصیب ہوتا ہے سب کچھ بقدرِ عزم وطلب
وہ اتنا پاتا ہے جتنا تلاش کرتا ہے

نہ کوئی خواب سلامت نہ آرزو نہ اُمنگ
وہ میری آنکھوں میں اب کیا تلاش کرتا ہے

تجھے خبر بھی ہے کتنوں کو کھا چکی دُنیا
تو کس امید پہ دنیا تلاش کرتا ہے

شکیلؔ اپنے گناہوں پہ شرمسار تو ہو
وہ بخشنے کا بہانہ تلاش کرتا ہے

غزل

فصیلِ شہرِ انا میں شگاف میں نے کِیا
یہ کارنامہ خود اپنے خلاف میں نے کِیا

مرا غلام بتاتا تھا خود کو جو ہر دم
بگڑ گیا جو ذرا اختلاف میں نے کِیا

تمہارے حسن کا چرچہ کروں گا پریوں میں
اگر کبھی سفرِ کوہِ قاف میں نے کِیا

بس ایک تیرے تعلق کی پاسداری میں
تمام شہر کو اپنے خلاف میں نے کِیا

مجھے خبر ہے کہیں کا بھی رہ نہ پاؤں گا
تیری رضا سے اگر انحراف میں نے کِیا

وہی کہا ہے جو معلوم ہے زمانے کو
کہاں شکیلؔ کوئی انکشاف میں نے کِیا

غزل

آج روشن ضمیر کوئی نہیں
شاہ سب ہیں فقیر کوئی نہیں

سب کے سب موت کے ہیں سوداگر
عافیت کا سفیر کوئی نہیں

تیری خوشبو کے آگے کون ٹکا
عود ، صندل ، عبیر کوئی نہیں

بے نیازانہ جی رہا ہوں شکیلؔ
آج مجھ سا امیر کوئی نہیں

☆

حسن کردار کا ایثار و وفا کا زیور
تجھ کو فطرت نے دیا خوب عطا کا زیور
میری بیٹی تیری پاکیزہ نگاہی کی قسم
زیب دیتا ہے تجھے شرم و حیا کا زیور

غزل

مِرے خدا نے جسے چاہا ارجمند کیا
تجھے بلند کیا مجھ کو سر بلند کیا

تجھے غرور کہ تجھ سا نہیں کوئی شاید
میرا قصور کہ میں نے تجھے پسند کیا

ترے لبوں کی حلاوت مجھے ہوئی محسوس
کہیں کسی نے اگر ذکرِ شہد و قند کیا

جہاں کسی نے بلایا پہنچ گیا میں شکیلؔ
انا کے خول میں خود کو کبھی نہ بند کیا

سب کو تیری محفل میں نمائش کی پڑی ہے
شائد وہ شرافت ہے جو کونے میں کھڑی ہے
کوئی نہیں روئے گا شکیلؔ آپ کے پیچھے
مرنا ہے تو مر جاؤ یہاں کس کو پڑی ہے

غزل

میرا دامن جو نم نہیں ہوتا
مجھ پہ اس کا کرم نہیں ہوتا

سب پہ اس کا کرم نہیں ہوتا
ہر کوئی محترم نہیں ہوتا

کیسے لکھوں قصیدۂ احباب
جھوٹ مجھ سے رقم نہیں ہوتا

ہو جہاں بات دوستی کی وہاں
ذکر دام و درم نہیں ہوتا

وہ اگر مجھ کو مل گئے ہوتے
دل کے جانے کا غم نہیں ہوتا

پیش کرتے وہی ہیں پس منظر
جن کے شعروں میں دم نہیں ہوتا

تجھ کو کیسے شکیلؔ سمجھاؤں
درد رونے سے کم نہیں ہوتا

غزل

میں ان کے آستاں کو دیکھتا ہوں
سکونِ قلب و جاں کو دیکھتا ہوں

بلندی میری قسمت میں لکھی ہے
زمیں پر آسماں کو دیکھتا ہوں

کہاں جاتے ہیں آخر جانے والے
فضائے بے کراں کو دیکھتا ہوں

کبھی شام وسحر رطب اللساں تھی
دھواں دیتی زباں کو دیکھتا ہوں

میں اپنے دشمنوں کی پشت پر اب
ہجوم دوستاں کو دیکھتا ہوں

مجھے ملتی ہے جنت کی بشارت
میں جب بھی اپنی ماں دیکھتا ہوں

شکیلؔ آخر مِری منزل کہاں ہے
میں اکثر آسماں کو دیکھتا ہوں

غزل

اس نے جذبہ ہی نہیں پایا پگھلنے والا
شمع کی طرح پتنگا نہیں جلنے والا

در گذر کرنے کی عادت سے ملا ہے یہ مقام
پھول برسانے لگا زہر اگلنے والا

لڑکھڑا جائے اگر کوئی تو خوشیاں نہ منا
گرتے گرتے بھی سنبھلتا ہے سنبھلنے والا

دوستوں کا کبھی احسان اٹھاتا ہی نہیں
لے کے بیساکھیاں دشمن کی اچھلنے والا

یہ جو کم ظرفوں نے کہرام مچا رکھا ہے
ایک دو دن سے زیادہ نہیں چلنے والا

نکتہ چینوں سے کہو عمر ہے تھوڑی ان کی
میں وہ سورج ہوں جو جلدی نہیں ڈھلنے والا

چال بازی تری خود تجھ کو ہی لے ڈوبے گی
ایک دن تو کفِ افسوس ہے ملنے والا

تو زمانے کی حمایت پہ بھروسہ مت کر
یہ ہے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا

مجھ کو پھونکوں سے بجھا پائے گا کیا کوئی شکیلؔ
وہ دیا ہوں جو ہے طوفان میں جلنے والا

☆ ☆ ☆

خوبی ہے اس میں کیا جو اکڑتا ہے آدمی
ہر وقت کیوں ہواؤں سے لڑتا ہے آدمی
جب تک خدا نہ چاہے تو ہوتا نہیں ہے کچھ
بنتا ہے آدمی نہ بگڑتا ہے آدمی
پہلے تو ڈینگ مارتا پھرتا ہے ہر طرف
پھر شرم سے زمین میں گڑتا ہے آدمی

غزل

اک شخص میرے خواب میں آ کر چلا گیا
کر کے مشامِ جاں کو معطّر چلا گیا

ہیرے کی طرح اس کا مقدّر چمک اٹھا
ہاتھوں میں میرے ہو کے جو پتھر چلا گیا

کیسی کشش ہے تجھ میں اے دوشیزۂ اجل
واپس نہ آیا جو تیرے در پر چلا گیا

سمجھا رہا تھا میں کہ بری چیز ہے انا
دستار خوں میں ڈوب گئی سر چلا گیا

اب کس کے انتظار میں بیٹھے ہو تم شکیلؔ
جو شخص آنے والا تھا آ کر چلا گیا

بزدل تو وہ نہیں تھا مگر کیا کہوں شکیلؔ
کیا جانے کیوں وہ چھوڑ کے لشکر چلا گیا

غزل

عمر بھر پائی نہ فرصت کام سے
دو گھڑی بیٹھے نہ ہم آرام سے

اپنی بربادی کے خود ہیں ذمّہ دار
ہے شکایت گردش ایّام سے

رات بھر دل کا عجب عالم رہا
شرط باندھی تھی چراغِ شام سے

تو ہرائے گا مجھے ممکن نہیں
باز آجا اس خیال خام سے

آگئی جو ان کے آنے کی خبر
دن نکل آیا میرے گھر شام سے

کھا کے ٹھوکر گر پڑے گا منہ کے بل
میرے بھائی چل ذرا آرام سے

آرزوؤں سے کنارہ کر لیا
ہم نے سیکھا یہ دلِ ناکام سے
شاعری ہم کو خوش آتی ہے شکیلؔ
داد سے مطلب نہ کچھ انعام سے

جو ہے جیسا تو اسے ویسا بتا کر پیش کر
کانچ کے ٹکڑوں کو مت ہیرا بتا کر پیش کر
اصل آخر اصل ہوتا ہے وہ چاہے کچھ بھی ہو
دیکھ پیتل کو نہ یوں سونا بتا کر پیش کر

☆

موگرا ، چمپاکلی ، جوہی ، گلاب
ڈال کر بیٹھے تھے ڈیرا سب کے سب
دیکھنے جیسی تھی صورت چاند کی
کر رہے تھے ذکر تیرا سب کے سب

غزل

زخم دیتے جائیں لیکن فکر مرہم بھی کریں
درد جب حد سے سوا ہو جائے تو کم بھی کریں

ہم سے الجھو گے تو پچھتانا پڑے گا ایک دن
در گذر جذبات کو تم بھی کرو ہم بھی کریں

کاٹتے ہیں رات دن چکر تیرے کوچہ کا ہم
تجھ سے فرصت پائیں تو پھر سیر عالم بھی کریں

ہجر کی شب میں ترے خط کو پڑھا کرتے ہیں ہم
نیند آئے تو دیئے کی لو کو مدّھم بھی کریں

اپنے در پر ہم کو بلوایا غنیمت ہے یہی
یہ ضروری تو نہیں وہ خیر مقدم بھی کریں

موت کی تکلیف سے بدتر ہے رنج انتظار
پاسداری وقت کی تم بھی کرو ہم بھی کریں

عاشقانِ زلفِ جاناں کے عجب اطوار ہیں
خود گرفتار بلا ہوں خواہشِ رم بھی کریں

اپنا مٹّی کا پیالہ ہم کو پیارا ہے بہت
ہم نہ دینگے پیش اگر وہ ساغرِ جم بھی کریں

اس کی اپنی سوچ ہے یہ اس کا اپنا ظرف ہے
بے وقوفی کر رہا ہے وہ تو کیا ہم بھی کریں

جاؤ ہم کو ایسی سرداری نہیں کرنی شکیلؔ
تعزیہ بھی ہم بنائیں اور ماتم بھی کریں

☆ ☆ ☆

شرم آنکھوں میں بسا لیتیں تو اچھا ہوتا
کوئی اندیشہ ہی رہتا نہ تو خطرہ ہوتا

بد نظر اٹھتی نہ بھولے سے تمہاری جانب
بیٹیو سر پہ تمہارے جو دوپٹّہ ہوتا

غزل

اپنی رَو میں کہہ کے جاتا ہے قلندر اور کچھ
سوچنے لگتا ہے لیکن بندۂ زر اور کچھ

بولنے لگتے ہیں وہ باتیں بدل کر اور کچھ
ہم پہنچتے ہیں تو ہو جاتا ہے منظر اور کچھ

جانتے ہیں جان ہم دیتے ہیں اس انداز پر
وہ ہمارے سامنے چلتے ہیں تن کر اور کچھ

ڈھونڈنا چاہا تھا میں نے اپنی چاہت کا صدف
ہو گیا گہرا ان آنکھوں کا سمندر اور کچھ

خیریت گزری کنویں میں ڈال کر رخصت ہوئے
چاہتے تھے ورنہ یوسفؑ کے برادر اور کچھ

میرا مقصد اور کچھ ہوتا ہے لیکن کیا کروں
بدگماں ہیں جو سمجھ لیتے ہیں اکثر اور کچھ

باغ میں بھی خوب یہ لگتا ہے لیکن سچ یہ ہے
اس کے بالوں میں کِھل اُٹھتا ہے گلِ تر اور کچھ

واقعہ کچھ اور ہوتا ہے مگر میرا حریف
دوستوں میں پیش کرتا ہے بنا کر اور کچھ

چاہتے تھے لوگ مجھ کو سرنگوں کرنا مگر
آکے نیزے پر ہوا اونچا میرا سر اور کچھ

صورتیں احباب کی دھندلی نظر آنے لگیں
صاف کردے آئینہ اے آئینہ گر اور کچھ

ہم کو ان میں سے نہ سمجھو وہ منافق ہیں شکیلؔ
پیٹھ پیچھے اور کچھ کہتے ہیں منہ پر اور کچھ

☆

ہوگیا ہے وہ کسی اور کا سب کہتے ہیں
ویسے اب تک تو مِرے خواب میں رکھا ہوا ہے

آیئے بات کریں پھر وہی بچپن جیسی
چھوڑیئے کیا ادب آداب میں رکھا ہوا ہے

غزل

جو بھی ملتا ہے اسے پاتا ہوں دیوانہ ترا
ہے بجا شہرت کی دیوی ناز فرمانا ترا

تو بھی اٹھ جائے گا جب اٹھ جائے گا دانہ ترا
طئے ہے اس دنیا سے بھائی ایک دن جانا ترا

مست کر دیتا ہے ہر انداز مستانہ ترا
بیٹھنا اٹھنا ترا آنا ترا جانا ترا

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب مجھ سے تھا یارانہ ترا
یاد آتا ہے وہ آنکھوں میں سماجانا ترا

دل بہلنے کی کوئی صورت نظر آتی نہیں
یاد بھی آتا نہیں اب یاد آجانا ترا

ایک مدّت ہوگئی ہے کل کے وعدے کو مگر
کل کا وعدہ یاد آجاتا ہے روزانہ ترا

آدمی کو آئینہ کردار ہونا چاہئے
کام آئے گا نہ تیرے آئینہ خانہ ترا

کیسے کیسے لوگ آئے اور رخصت ہو گئے
اے شکیلؔ اچھا نہیں اس درجہ اترانا ترا

☆

قصیدہ خوانی احباب ہم نہیں کرتے
تعلقات کی توقیر کم نہیں کرتے

☆

اپنی ہستی کو دھواں کرتے رہے
ہم زمیں کو آسماں کرتے رہے
تالیوں پر تالیاں بجتی رہیں
لوگ اپنا دُکھ بیاں کرتے رہے

غزل

محفوظ انہیں رکھنا کام آئیں گے آنسوؑ بھی
کل بیٹھ کے روئے گا میری ہی طرح توٗ بھی

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا
تخریب میں ہوتا ہے تعمیر کا پہلوٗ بھی

کیا یاد نہیں تجھ کو پھرتی تھی مِرے پیچھے
پیش آنے لگی دنیا دشمن کی طرح توٗ بھی

حالات سے سمجھوتا کرنا بھی ضروری ہے
ہوتا ہے اندھیرا تو اِتراتے ہیں جگنوٗ بھی

☆

تیرے حصّے کی دھوپ میں لے لوں
میرے حصّے کی چھاؤں تو لے لے
صرف اُس کی گلی مجھے دے دے
اور جا سارا گاؤں تو لے لے

غزل

جلائے بیٹھا ہے ہر کوئی آگہی کا چراغ
اجالا دیتا ہے لیکن کسی کسی کا چراغ

ہمارے پیچھے جلائے نہ کیوں وہ گھی کا چراغ
ہمارے سامنے جلتا نہیں کسی کا چراغ

جو تیل ڈال رہا ہے اسے نہیں معلوم
اسی کے گھر کو جلائے گا کل اسی کا چراغ

ہمارے بعد کوئی سر پھرا نہ آئے گا
ہماری راہ تکے گا تِری گلی کا چراغ

کوئی بھروسہ نہیں کب یہ داغ دے جائے
ہوا کی زد پہ مسلسل ہے زندگی کا چراغ

گمان ہوتا ہے رہ رہ کے اس کے بجھنے کا
بھڑکتا رہتا ہے ہر وقت مفلسی کا چراغ

شکیلؔ ہم کو اندھیروں سے ڈر نہیں لگتا
خدا کے فضل سے روشن ہے آگہی کا چراغ

غزل

وہ میرے دل میں مکیں آج بھی ہے
دل جہاں کل تھا وہیں آج بھی ہے

میری وحشت میں کمی ہو بھی تو کیوں
چاند اتنا ہی حسیں آج بھی ہے

میرا اصرار بدستور وہی
اسکے ہونٹوں پہ نہیں آج بھی ہے

عمر پر زور نہیں ہے لیکن
اسکے آنے کا یقین آج بھی ہے

چھوٹ کل بھی تھی درندوں کے لیے
خون سے لال زمیں آج بھی ہے

سر بلندی پہ کب اِتراتے ہیں ہم
پاؤں کے نیچے زمیں آج بھی ہے

بات کرتے ہو وفا کی جو شکیلؔ
کیا یہ دستور کہیں آج بھی ہے

غزل

کون کہتا ہے علاج غمِ تنہائی کر
تیرا دیوانہ ہوں بس حوصلہ افزائی کر

تیرے احسان کا بدلہ نہ چکا پاؤں گا
مجھ سے اس درجہ محبت نہ میرے بھائی کر

پھر بتانا یہ فلاں ہے یہ فلاں ہے یہ فلاں
پہلے آپ اپنے سے اے دوست شناسائی کر

آئینہ دیکھ تو کیا کہتا ہے تیرے منہ پر
ناز یکتائی نہ اے نازشِ یکتائی کر

جان لے پہلے تضادِ ہوس وعشق اے دوست
یوں نہ ہر چاہنے والے کی پذیرائی کر

جاننے والے بھی پل بھر میں بدل جاتے ہیں
ہر کسی سے نہ تو' اظہارِ شناسائی کر

مانگ اس سے کہ وہی دے گا وہی دیتا ہے
کہہ دیا کس نے کہ ہر در پہ جبیں سائی کر

دیکھ کیا کہتے ہیں احباب پس پشت شکیلؔ
خود فریبی میں نہ رہ اور نہ خود رائی کر

لگ جائے میری عمر بھی اس کو خدا کرے
اِک شخص آج پھر مِری آنکھیں بھگو گیا

☆

جانتا ہوں کہ تو نہ آئے گا
پھر بھی رہتا ہے انتظار تیرا

☆

اب نئے سال کی آنے کی خوشی کیا ہو شکیلؔ
ہر نیا سال نیا زخم لگا جاتا ہے

غزل

دل بے قرار کیوں نہ ہو نخچیر کی طرح
چبھتی ہے گل رُخوں کی نظر تیر کی طرح

رانجھے کی طرح قید ہوں اپنے مکاں میں
چپکے سے دیکھتا ہے کوئی ہیر کی طرح

پوُچھا بھی اس نے حال ہمارا تو غیر سے
یعنی ہے التفات بھی تعزیر کی طرح

دونوں کا ایک حال ہے پرساں نہیں کوئی
ہے شامِ غم بھی عاشقِ دلگیر کی طرح

حیران ہوں میں صورت آئینہ اے شکیلؔ
بیٹھا ہے سامنے کوئی تصویر کی طرح

نگاہ پھیر کے کچھ لوگ یہ سمجھنے لگے
مِرا وجود زمانے سے مِٹ گیا ہوگا

غزل

ذہن میں یاروں کے آلائش نظر آئی مجھے
دوستی کی آڑ میں رنجش نظر آئی مجھے

کوئی دنیا کی نظر میں ہم سے آگے بڑھ نہ جائے
ہر کسی دل میں یہ خواہش نظر آئی مجھے

کیا خبر تھی مجھ کو اپنے قد سے ناپا جائے گا
ہر نظر میں فکرِ پیمائش نظر آئی مجھے

جب بھی آیا اس بتِ آئینہ سیما کا خیال
اپنی ہستی محوِ آرائش نظر آئی مجھے

جھوٹی شہرت کی طلبگاری ارے توبہ شکیلؔ
ہر طرف باہم دگر سازش نظر آئی مجھے

مِرے کِردار پہ اُنگلی نہ اُٹھاؤ ، میں نے
زندگی ایسے گزاری ہے کہ جی جانتا ہے

غزل

محفوظ ہے انا میری غربت کے باوجود
پھیلا کبھی نہ ہاتھ ضرورت کے باوجود

اس کو منافقت نہ کہوں میں تو کیا کہوں
دعویٰ ہے دوستی کا عداوت کے باوجود

سر کو پٹکتی رہ گئیں منہ زور آندھیاں
جلتے رہے چراغ کھلی چھت کے باوجود

اللہ مجھ کو ایسوں کی صحبت سے دور رکھ
گمراہ ہو گئے جو ہدایت کے باوجود

حدّ ادب سے میں کبھی باہر نہیں ہوا
اتنا تو ہوش تھا مجھے وحشت کے باوجود

ہم نے کبھی عدوٗ کا سہارا نہیں لیا
آپس میں اختلاف کی شدّت کے باوجود

مجھ کو شکار کر کے بھی وہ تلملا اٹھے
میں مسکرا رہا تھا اذیت کے باوجود

مجھ پر میرے بزرگوں کا سایہ ہے اے شکیلؔ
میں مطمئن ہوں دھوپ کی شدّت کے باوجود

☆

اُسے کیا خبر تھی کہ میں کون ہوں
وہ شرمندہ ہے اپنے برتاؤ پر

☆

تو مجھے چھوڑ کر نہ جایا کر
زہر لگتی ہے مجھ کو تنہائی

☆

وہ مِرا ساتھ دینے والا تھا
اور پھر راستے میں چھوڑ گیا

غزل

یہ سانحہ بھی تھا میری رسوائیوں کے ساتھ
وہ بھی کھڑے ہوئے تھے تماشائیوں کے ساتھ

انسان ہوں فرشتہ سمجھ کر نہ مجھ سے مل
مجھ میں برائیاں بھی ہیں اچھائیوں کے ساتھ

تو' میرا دوست ہے تو گریزاں ہے کس لئے
مجھ کو قبول کر میری رسوائیوں کے ساتھ

اب قافلے ٹھہرتے نہیں اس کنویں کے پاس
بابا مجھے نہ بھیجو میرے بھائیوں کے ساتھ

مجھ تک پہنچ نہ پائے گا کہہ دو اسے شکیلؔ
ناحق الجھ رہا ہے وہ پرچھائیوں کے ساتھ

اے سُنہری بال والے شخص تجھ کو کیا پتہ
جھیل کے اُس پار اب تک چاندنی بے چین ہے

غزل

خم و سبو ترے، مئے تیری، جام تیرا ہے
یہ میکدہ میرے ساقی تمام تیرا ہے

نہیں مجال کسی میں جو کر سکے تحریف
تیرے کمال کا شاہد کلام تیرا ہے

قصیدہ خوانی اجداد تا بکے آخر
وہ کام کر مرے بھائی جو کام تیرا ہے

مجھے دکھائے گی کیا چال گردشِ ایّام
میری نگاہ میں حسن خرام تیرا ہے

کہاں وہ زلفِ پریشاں کہاں دلِ وحشی
جنونِ شوق یہ سب اہتمام تیرا ہے

خبر بھی ہے تجھے او مجھ کو بھولنے والے
ابھی تلک میرے ہونٹوں پہ نام تیرا ہے

شکیلؔ خود کو مٹا دے رہِ محبت میں
ترِی فنا میں ہی مضمر دوام تیرا ہے

غزل

کہاں جاتی مرے در پر جو بے چاری نہیں آتی
کسی کو بھی وفا کی ناز برداری نہیں آتی

اسے کہہ دو ہمیشہ کام ہشیاری نہیں آتی
کسی کم ظرف کے حصّے میں سرداری نہیں آتی

تو کتنی بار اٹھ اٹھ کر مجھے لوری سناتی ہے
کبھی اے ماں تیرے لہجے میں بیزاری نہیں آتی

کوئی تو ہے جو اکثر چٹکیاں لیتا ہے اندر سے
بنا تکلیف تو ہونٹوں پہ سسکاری نہیں آتی

ادب میں امتیازی حیثیت جنکی مسلّم تھی
غزل اب ان رسالوں میں بھی معیاری نہیں آتی

جو بوتا ہے وہی تو کاٹنا پڑتا ہے انساں کو
ببولوں کے عوض حصّے میں پھلواری نہیں آتی

تو کیسے دوستوں کا اصل چہرہ سامنے آتا
اگر مجھ کو بھی تھوڑی سی اداکاری نہیں آتی

میرے بھائی اگر تو' آگ سے کھیلا نہیں ہوتا
ترے دامن پہ ہرگز اڑ کے چنگاری نہیں آتی

وہ جب بھی دیکھتے ہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
ہم ان سے کیا ملیں جن کو ملنساری نہیں آتی

یہ ہم ہی ہیں جو اس کا راستہ ہموار کرتے ہیں
نہیں تو اتنی آسانی سے بیماری نہیں آتی

بتا کیا بات ہے سب ٹھیک ہوتا تو میرے بھائی
ہنسی تیرے لبوں پر یوں تھکی ہاری نہیں آتی

ہم اس کے در سے لوٹ آئے شکیل اپنا سا منہ لیکر
جب اس نے یہ کہا جا ہم کو دلداری نہیں آتی

رشتے تمام دل سے نبھاتی ہیں بیٹیاں
ماں باپ کا وقار بڑھاتی ہیں بیٹیاں
اللہ کے رسول کو تھیں بیٹیاں عزیز
ہم کو شکیل اس لئے بھاتی ہیں بیٹیاں

غزل

بس یہ ہوا کہ آپ نے اپنا کہا مجھے
آنکھیں دکھا رہا ہے عبث آئینہ مجھے

رہ رہ کے کون دیتا ہے آخر صدا مجھے
اس شہر میں تو کوئی نہیں جانتا مجھے

سمجھوں گا بادشاہی ملی دو جہان کی
دنیا اگر غلام کہے آپؐ کا مجھے

پھرتا رہا ہوں کوئے ملامت میں دربدر
کوئی نظر نہ آیا وفا آشنا مجھے

بیزار ہو نہ جاؤں کہیں زندگی سے میں
بس اور دیجئے نہ فریبِ وفا مجھے

واقف ہوں زندگی کے نشیب وفراز سے
ہر موڑ پر فریب تمنّا ملا مجھے

اب اور اے شکیلؔ دکھائے گا وقت کیا
نا آشنا لگے ہے ہر اک آشنا مجھے

غزل

غمِ دنیا سے سروکار نہیں ہے کوئی
اے مسیحا مجھے آزار نہیں ہے کوئی

طئے ہو کس طرح بھلا مرحلۂ منزلِ دوست
دل شکن لاکھوں ہیں دلدار نہیں ہے کوئی

تِری یادوں کے تصدّق تِرے وعدوں پہ نثار
دکھ نہیں ہے کوئی آزار نہیں ہے کوئی

ان کی یاد آنے پہ موقوف ہے اشکوں کا ورُود
موسم دیدۂ خوں بار نہیں ہے کوئی

شرحِ بربادیٔ دل کس لئے کرتے ہو شکیلؔ
پیار پھر پیار ہے بیوپار نہیں کوئی

تو مِرے خدّ و خال پر مت جا
میں بھی اندر سے خوبصورت ہوں

غزل

ممکن نہیں وہ آئے نزاکت کیئے بغیر
کر انتظار شکوۂ فرقت کیئے بغیر

عالم نہ پوچھ بزم تصور کا ہم نشیں
وہ آگئے ہیں آنے کی زحمت کیئے بغیر

موقوف کچھ ہمیں پہ نہیں ان کو دیکھ کر
آئینہ بھی نہ رہ سکا حیرت کیئے بغیر

گویا زمیں نہیں کوئی پھولوں کی سیج ہو
رکھتے نہیں ہیں پاؤں نزاکت کیئے بغیر

بھیجا ہے اس نے وصل کا پیغام غیر سے
دعوت بھی دے سکا نہ عداوت کیئے بغیر

معراجِ عشق پا نہیں سکتا کوئی شکیلؔ
ہوش و حواس و عقل کو رخصت کیئے بغیر

غزل

نہ راس آئے گی مجھ کو فضائے باغ ابھی
مِرے جنوں کو میسّر نہیں فراغ ابھی

میں کیا کہوں میرا سینہ ہے داغ داغ ابھی
نہیں سنیں گے کسی کی دل و دماغ ابھی

وہ چاہتا ہے کہ تاریکیاں مفسلّط ہوں
میں چاہتا ہوں کہ جلتے رہیں چراغ ابھی

مرے علاوہ کوئی پھر نظر نہ آئے گا
زمانہ ڈھونڈ رہا ہے مِرا سراغ ابھی

کسی چراغ کا احسان کیوں اٹھاؤں میں
اجالا دے تو رہے ہیں جگر کے داغ ابھی

میں انتظار کی لذّت اٹھانا چاہتا ہوں
مری منڈیر پہ بیٹھے نہ آ کے زاغ ابھی

یہ دیکھنا ہے کہاں تک چلے گا جھوٹ اسکا
دکھا رہا ہے وہ لوگوں کو سبز باغ ابھی

اندھیرا دیکھ رہا ہے بڑی رعونت سے
سحر ہے دور جلائے رکھو چراغ ابھی

ملی ہے میری بدولت ہی روشنی تجھ کو
ہے آسمان پہ لیکن تیرا دماغ ابھی

تو دیکھتا ہے کسی اور کی نظر سے مجھے
دکھائی دے گا تجھے آئینے میں داغ ابھی

شکیلؔ چاند ستاروں سے مجھ کو کیا لینا
میرے مکان کی زینت ہے اِک چراغ ابھی

☆

تجھ سے ناراض ہے یہ ماں تیری
ہر عبادت ہے رائیگاں تیری

☆

جسے تم نے کِیا ہوگا مخاطب
وہ پاگل ہو گیا ہوگا خوشی سے

غزل

تیر و کماں کے ساتھ نہ تیغ وتبر کے ساتھ
ہم جنگ خالی ہاتھ لڑے ہیں جگر کے ساتھ

دل بھی اداس اداس ہے دیوار ودر کے ساتھ
لپٹی ہیں آرزوئیں تری رہ گذر کے ساتھ

منسوب تیری یاد ہے دیوار و در کے ساتھ
پھر کیوں نہ ہو لگاؤ مجھے اپنے گھر کے ساتھ

بولی کوئی لگائے تو مہر و خلوص کی
ہم خود کو بیچ دیں گے متاعِ ہنر کے ساتھ

اب دیکھئے وہ آئیں گے یا موت آئے گی
باندھی ہے دل نے شرط چراغِ سحر کے ساتھ

غصّے سے لال ہو گیا سورج یہ دیکھ کر
شبنم الجھ رہی تھی نسیمِ سحر کے ساتھ

مشکل میں جب پڑوگے تو خود جان جاؤ گے
احباب پیش آتے ہیں کس کس ہنر کے ساتھ

ساحل پہ دم بخود تھی تماشائیوں کی بھیڑ
کشتی ہماری کھیل رہی تھی بھنور کے ساتھ

آگے کسی کے ہاتھ پسارا نہیں کبھی
رہتے ہیں مفلسی میں بھی ہم کروفر کے ساتھ

سچائی سامنے نہیں آتی عوام کے
ہوتی ہے چھیڑ چھاڑ ہمیشہ خبر کے ساتھ

آساں نہیں ہے معرکۂ زندگی شکیلؔ
دستار بھی سنبھالنی پڑتی ہے سر کے ساتھ

تو کیا سونا پڑا رہتا ہے پنگھٹ
سُنا ہے اُس کی شادی ہوگئی ہے

میں تو یہ سوچ کے چُپ ہوں کی کہیں شہر کے لوگ
تِرے بارے میں غلط رائے نہ قائم کرلیں

غزل

کوئی کتنا ہی ہوشیار ہوا
گردشِ وقت کا شکار ہوا

یوں میں حالات کا شکار ہوا
ذہن سے محو عکسِ یار ہوا

ہم نے سو سو طرح قسم کھائی
لیکن ان کو نہ اعتبار ہوا

لوگ ملتے رہے گلے لیکن
دور دِل سے کہاں غبار ہوا

سب کی نظریں اٹھیں مِری جانب
تذکرہ تیرا جتنی بار ہوا

کوچۂ یار میں گیا جو بھی
مرضِ عشق کا شکار ہوا

لوگ کہتے ہیں اس گلی میں شکیلؔ
کل تیرا ذکر بار بار ہوا

غزل

اچھا ہدف ہوں گردش حالات کے لئے
کرتا نہیں ہوں منع کسی گھات کے لئے

ایسا نہیں کہ کوئی نہیں ہے میرے قریب
حاضر ہیں درد و رنج مدارات کے لئے

پھر اس کے بعد نیند نہیں آئی عمر بھر
ٹھہرا تھا میرے گھر کوئی اِک رات کے لئے

کس کو خبر تھی تو بھی مجھے چھوڑ جائے گا
چھوڑا تھا میں نے سب کو تیرے ساتھ کے لئے

ہے دوستوں کو چھوٹ جو چاہیں کریں سلوک
میں ٹوکتا نہیں ہوں کسی بات کے لئے

بوسیدگی لباس کی حارج ہوئی شکیلؔ
ہم بھی گئے تھے ان سے ملاقات کے لئے

غزل

فضائے باغ کو آخر لگی نظر کیسے
غموں کے پھول کھلے ہیں شجر شجر کیسے

تیرے علاوہ میرے دل میں کوئی تھا ہی نہیں
میرا خیال بھٹکتا اِدھر اُدھر کیسے

کہاں مجال کہ پوچھے یہ باغباں سے کوئی
بھری بہار میں سوکھا ہے اِک شجر کیسے

تمہاری یاد کی خوشبو عزیز ہے مجھ کو
تمہارے خط کو میں کرتا اِدھر اُدھر کیسے

مجھے یقین ہے اپنے خدا کی قدرت پر
تو یہ نہ سوچ کروں گا گذر بسر کیسے

ہیں شک کے گھیرے میں کیوں حق بیانیاں میری
وہ جھوٹ کہہ کے بھی ٹھہرا ہے معتبر کیسے

وہ چاہتا ہے بکھر جائے میرا شیرازہ
مجھے یہ فکر بچاؤں میں اپنا گھر کیسے

جو تم زبان پہ کانٹے سجائے پھرتے ہو
تو پھر بتاؤ دلوں میں کرو گے گھر کیسے

قدم قدم پہ الجھتے ہو پتھروں سے شکیلؔ
تمہارے ساتھ کرے گا کوئی سفر کیسے

☆

تم سے نفرت بھی سلیقے سے نبھائی نہ گئی
ہم نے تو خود کو محبت میں فنا کرڈالا

☆

گھر میں تنگی کا ذِکر نِکلا تھا
ماں نے چوڑی اُتار کر دے دی

غزل

رہتے ہیں میری تاک میں صدمات مستقل
دکھ درد جھیلتی ہے میری ذات مستقل

مدت ہوئی کہ خود سے بھی میں مل نہیں سکا
گھیرے ہوئے ہیں گردشِ حالات مستقل

آساں نہیں ہے منزلِ عرفان و آگہی
سہنا پڑے گا تم کو غمِ ذات مستقل

کیا جانے کس گمان میں ہیں رہبرانِ وقت
بھڑکا رہے ہیں قوم کے جذبات مستقل

جو چاہتا ہے اس کی کوئی بات رد نہ ہو
رہتا نہیں کسی کے بھی وہ ساتھ مستقل

میں دشمنوں کے ساتھ نبردآزما رہا
احباب اِدھر لگائے رہے گھات مستقل

رکھنا نہ پاؤں دشتِ تمنّا میں بھول کر
رہتے ہیں اس نواح میں خطرات مستقل

اپنا خیال رکھنا میں پھر آؤں گا شکیلؔ
ہوتی رہے گی اب تو ملاقات مستقل

☆

خوب ہے ماہتاب بھی لیکن
آپ سا حُسنِ دَلفریب کہاں

☆

ذکر آیا تھا تیری محفل میں
رات بھر چاندنی مچلتی رہی

غزل

ادھر آ گئے ما بدولت کہاں
کہاں آپ کوئے ملامت کہاں

اٹھاتے ہیں وہ اتنی زحمت کہاں
انھیں ہم سے ملنے کی فرصت کہاں

وہ یہ کہہ کے کرتے ہیں نشتر زنی
جراحت بنا ہوگی راحت کہاں

نبھاؤ گے تم ساتھ تا زندگی
مگر زندگی کی ضمانت کہاں

سزا دے خطا کار بیٹے کو جو
عمرؓ جیسی طرزِ حکومت کہاں

جو تھے معترض میری دستار پر
رہی ان کی پگڑی سلامت کہاں

سمجھتے ہو سب ٹھیک کر لو گے تم
میاں موت دیتی ہے مہلت کہاں

غرض ان کو رنگیں بیانی سے ہے
سنیں گے وہ میری حکایت کہاں

جو بنیاد ٹیڑھی رکھی جائے گی
تو سیدھی بنے گی عمارت کہاں

عزیزو مِرا حال خود دیکھ لو
مرے کام آئی شرافت کہاں

مقام اس کا اپنی جگہ ہے مگر
کہاں آسماں آپ کی چھت کہاں

جسے دل سے چاہا وہ دشمن ہوا
مجھے راس آئی محبت کہاں

اگر دل دکھاؤ گے ماں باپ کا
میسّر تمہیں ہوگی راحت کہاں

اگر چھوڑ دی جائے ان کی گلی
تو دنیا میں پھر کوئی جنت کہاں

سنواریں گے کیا میری تقدیر وہ
انھیں آئینے سے ہی فرصت کہاں

یہ دل ہے کسی کی بھی سنتا نہیں
اسے کر رہے ہو نصیحت کہاں

یہ مانا حسیں چاند بھی ہے مگر
تیرے جیسی شکل و شباہت کہاں

بھلا ان کو کیسے منائیں گے ہم
انھیں بات کرنے کی فرصت کہاں

وہ چاہیں تو بن جائے بگڑی مِری
مگر وہ اُٹھاتے ہیں زحمت کہاں

غزل سب نے اچھی کہی ہے مگر
شکیلؔ آپ جیسی فصاحت کہاں

غزل

جتنی آس لگاؤ گے اتنا رنج اٹھاؤ گے
میں نے دھوکا کھایا ہے تم بھی دھوکا کھاؤ گے

مجھ کو چھوڑ کے جاؤ گے دیکھو تم پچھتاؤ گے
جب میری یاد آئے گی روؤ گے چلاّؤ گے

مجھ کو تنہا کرتے ہو خود تنہا ہو جاؤ گے
میں نے اگر منہ کھول دیا کس کو منہ دکھلاؤ گے

ایسا کوئی فرد نہیں جس کے دل میں درد نہیں
کس کا چہرہ ذرد نہیں کس کس کے کام آؤ گے

چاہو جو فن کی معراج رکھنی ہو جو شہر کی لاج
مجھ سے فیض اٹھالو آج ورنہ کل پچھتاؤ گے

رنج اٹھاؤ درد سہو لیکن جو سچ ہے وہ کہو
آئینو کے ساتھ رہو آئینہ بن جاؤ گے

کرتے ہیں سب پا کر ڈھیل اپنے مقصد کی تکمیل
دنیا ہے عیّار شکیلؔ تم کب ہوش میں آؤ گے

غزل

توڑ سکتا ہوں میں زعم ہمہ دانی تیرا
ایک جملے میں اتر جائے گا پانی تیرا

کوئی پہنچا نہیں مفہوم کی گہرائی تک
مجھ پہ احسان ہے آشفتہ بیانی تیرا

اس نے منجھدار میں یہ کہہ کے مجھے چھوڑ دیا
دیکھ کیا کرتی ہے موجوں کی روانی تیرا

مسئلہ نیند کا تھا وہ تو نہیں آنی تھی
واسطہ دیتی رہی رات کی رانی تیرا

تیری صحبت نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو
ستیّا ناس ہو اے عہدِ جوانی تیرا

تو بھی یکتائے زمانہ ہے یگانہ میں بھی
نہ تو ثانی کوئی میرا ہے نہ ثانی تیرا

تیری تصویر کے جیسی کوئی تصویر نہیں
تذکرہ کرتا ہے بہزاد سے مانی تیرا

تو میرا ساتھ نبھائے گی کہاں تک آخر
کیا بھروسہ ہے بتا ہستیِ فانی تیرا

لوگ بن دیکھے ہی بن جاتے ہیں گرویدہ شکیلؔ
شعر سنتے ہیں جب اوروں کی زبانی تیرا

☆

آپ کی آنکھ میں جو کاجل ہے
وہ مِری آہ کا دھوں تو نہیں

☆

دِل نے بس تیری آرزو کی تھی
دِل میں پھر کوئی آرزو نہ رہی

غزل

دل اگر بے قرار ہے تو رہے
کہہ دیا اس نے پیار ہے تو رہے

ہم قفس میں پڑے ہیں ہم کو کیا
گلستاں میں بہار ہے تو رہے

ہم تو دل اپنا صاف رکھتے ہیں
ان کے دل میں غبار ہے تو رہے

ہم کو ہستی کا اعتبار نہیں
آپ کو اعتبار ہے تو رہے

اہل ثروت کو اس سے کیا لینا
شہر میں انتشار ہے تو رہے

کیوں ملاؤں میں اس کی ہاں میں ہاں
صاحب اختیار ہے تو رہے

اس کی فطرت کو جانتا ہوں میں
لاکھ وہ دیندار ہے تو رہے

ہم ہیں خوش اپنی تنگدستی میں
کوئی سرمایہ دار ہے تو رہے
ہم ازل سے ہیں شب گزیدہ شکیلؔ
صبحِ نو تار تار ہے تو رہے

☆

رات ہونے کو آرہی ہے شکیلؔ
جاؤ سورج لپیٹ کر رکھ دو

☆

ذِکر تو چل رہا تھا حوروں کا
آپ کیوں منہ چھُپا کے بیٹھ گئے
سیرِ جنّت کی آرزو تھی سو ہم
تیرے کوچے میں آکے بیٹھ گئے

غزل

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے کہ چل رہا ہے
سنبھل رہا ہے پھسل رہا ہے کہ چل رہا ہے

یہ اس کہ ہاتھوں میں کیا ہے بیساکھیوں کے جیسا
پتا کرو کہ اچھل رہا ہے کہ چل رہا ہے

جِسے سہارا دیا تھا میں نے قدم قدم پر
وہ مجھ سے آگے نکل رہا ہے کہ چل رہا ہے

قیامتیں ڈھا رہا ہے طرز خرام اس کا
وہ میرے دل کو کچل رہا ہے کہ چل رہا ہے

سبھی کو لگتا تھا اب گرے گا بس اب گرے گا
اسی لئے تو وہ کھل رہا ہے کہ چل رہا ہے

سخن طرازوں نے رنگ کیا کیا بدل کے دیکھے
بس اک فسونِ غزل رہا ہے کہ چل رہا ہے

شکست نے حوصلہ بڑھایا مرا یہ کہہ کر
شکیلؔ تو ہاتھ مل رہا ہے کہ چل رہا ہے

غزل

اوّل اوّل مجھ کو بھی اپنے جیسا سمجھے تھے لوگ
شہرِ سخن میں دیکھ رہے ہیں لیکن اب حیرت سے لوگ

سوچ رہا ہوں میری باری کیا جانے کب آئے گی
دھیرے دھیرے اٹھتے جاتے ہیں سب اچھے لوگ

حاکم کا فرمان ہے لیکن بستی میں سناٹا ہے
ڈھول بجائیں جشن منائیں کیسے بھوکے ننگے لوگ

کون یہ کہتا ہے دنیا سچے لوگوں سے خالی ہے
ڈھونڈو گے تو مل جائیں گے ہم ایسے کچھ چھوٹے لوگ

یوں لگتا ہے ان سے بڑھ کر عالم فاضل کوئی نہیں
بڑی بڑی باتے کرتے ہیں اب تو چھوٹے چھوٹے لوگ

اوروں سے اپنی توصیف کی رکھتے ہیں امید شکیلؔ
بے مطلب تعریف نہیں کرتے تعریف کے بھوکے لوگ

غزل

لگے گا اپنا کوئی پرایا تو کیا کرو گے
وفا کا موسم نہ راس آیا تو کیا کرو گے

میری محبت کا تذکرہ ہے فضول لیکن
چبھے گی جب دھوپ تو سایہ سایہ کیا کرو گے

تمہارے معیار پر میں پورا اتر نہ پایا
کسی نے تم کو بھی آزمایہ تو کیا کرو گے

تم اپنے ماضی کو بھول جاؤ گے مانتا ہوں
نئ رتوں نے اگر ستایا تو کیا کرو گے

چلو میں خود ہی تمہارے رستے سے ہٹ رہا ہوں
اگر کوئی دوسرا نہ بھایا تو کیا کرو گے

ہمارے چہرے کے داغ دھبے بجا ہیں لیکن
جو ہم نے بھی آئینہ دکھایا تو کیا کرو گے

میں خوش ہوں تم نے مجھے بھلانے کی ٹھان لی ہے
شکیلؔ میں پھر بھی یاد آیا تو کیا کرو گے

غزل

رنج و غم صاحب اسباب کہاں جانتے ہیں
لذّت گریۂ شب تاب کہاں جانتے ہیں

اِک کھلونا ہے ہمارے لئے اے دریا
تیرے گرداب کو گرداب کہاں جانتے ہیں

مجھ کو معلوم ہے تو میرا نہیں ہے لیکن
میری آنکھوں میں بسے خواب کہاں جانتے ہیں

خوش ہیں جو چاند ستاروں کا قصیدہ لکھ کر
وہ ابھی تیری تب و تاب کہاں جانتے ہیں

ہم تو ہیں گاؤں کی چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگ
ہم تیرے شہر کے آداب کہاں جانتے ہیں

زندگی کاٹی ہے پیوند لگے کپڑوں میں
اہل دل ریشم و کمخواب کہاں جانتے ہیں

کیسے ہوتے ہیں اجالوں کو ترستے ہوئے گھر
یہ تیرے طاق یہ محراب کہاں جانتے ہیں

چاہے جس نام سے تم ہم کو پکارو صاحب
ہم ہیں دیوانے ہم القاب کہاں جانتے ہیں

یہ تو بس اک وسیلہ ہے خود آگاہی کا
خواب کو اہل نظر خواب کہاں جانتے ہیں

اہل حق کیسے جماتے ہیں دلوں پر قبضہ
یہ ہنر صاحب القاب کہاں جانتے ہیں

ہم تو ہیں دھوپ کی شدت میں جھلستے ہوئے لوگ
لطف خس خانہ و برفاب کہاں جانتے ہیں

کس طرح خود کو سنبھالے ہوئے بیٹھا ہوں شکیلؔ
میری مشکل مرے احباب کہاں جانتے ہیں

ایک مُدّت سے پریشان ہے میرے پیچھے
مجھ کو آتی ہے ہنسی اپنی پریشانی پر

غزل

عیش میں درد کے پہلو بھی نکل سکتے ہیں
ہنسنے والے ترے آنسو بھی نکل سکتے ہیں

سارے احباب ہوں مخلص یہ ضروری تو نہیں
آستینوں میں سے چاقو بھی نکل سکتے ہیں

میرے ہونٹوں پہ ہنسی اب نہیں آنے والی
گُدگُداؤگے تو آنسو بھی نکل سکتے ہیں

چھیڑ دوں ذِکر اگر تیری غزال آنکھوں کا
دشت و کوہسار سے آہو بھی نکل سکتے ہیں

تو میرے حال پہ ہنستا ہے مگر یاد رہے
کل تِری آنکھ سے آنسو بھی نکل سکتے ہیں

اے ستارو تم اکیلا نہ سمجھنا خود کو
چاند ڈوبے گا تو جگنو بھی نکل سکتے ہیں

اس سے ملتے ہوئے کب ہم نے یہ سوچا تھا شکیلؔ
اختلافات کے پہلو بھی نکل سکتے ہیں

غزل

نہ کیوں عزیز ہو ہم کو خیال کی خوشبو
ملی ہے ہجر میں تیرے وصال کی خوشبو

سجا لئے ہیں تبسّم کے پھول ہونٹوں پر
عیاں نہ ہو کہیں رنج وملال کی خوشبو

وہ ایک عمر کے بعد آج آنے والے ہیں
سمیٹ لاؤ گئے ماہ وسال کی خوشبو

چمک ملی ہے ستاروں کو تیری آنکھوں سے
گلوں نے پائی ترِے خد و خال سے خوشبو

میں چپ ہوں یوں کہ کہیں رائیگاں نہ ہو جائے
ترِے جواب کی طالب سوال کی خوشبو

ہمیں جنون ہے دو ٹوک بات کرنے کا
ہمیں پسند نہیں قیل وقال کی خوشبو

اگر کمال نہیں یہ تمہاری چاہت کا
میرے وجود میں کس نے بحال کی خوشبو

شکیلؔ شعر تیرے سن کے سب مہکنے لگے
یہ تیرے لہجے میں ہے کس کمال کی خوشبو

ستارے جھانک رہے تھے تمہاری کھڑکی سے
پتا نہیں انہیں پھر کیا ہوا کہ ڈوب گئے

بنے تھے دوست جو موجِ بلا کے ڈوب گئے
شکار ہو گئے اپنی انا کے ڈوب گئے
بڑا غرور تھا جن کو بھنور سے بچنے پر
سنا یہ ہے وہ کنارے پہ آ کے ڈوب گئے

غزل

بات کرنی محال تھوڑی ہے
آبرو کا سوال تھوڑی ہے

اس میں دھبّے دکھائی دیتے ہیں
چاند تیری مثال تھوڑی ہے

سب ہی کرتے ہیں ذکرِ ہجر و وِصال
یہ اچھوتا خیال تھوڑی ہے

بات تو جب ہے دل کو لگ جائے
شعر کہنا محال تھوڑی ہے

کیا شکایت کریں کسی سے ہم
کوئی پرسانِ حال تھوڑی ہے

بھول جاؤں میں تم کو جیتے جی
میری اتنی مجال تھوڑی ہے

کچھ نہ کچھ بات ہے ضرور شکیلؔ
بے سبب اشتعال تھوڑی ہے

غزل

یہ کیسی روشنی ہے جس کو عام کر دیا گیا
سبھی کو خواہشات کا غلام کر دیا گیا

ہر ایک رنج پہلے میرے نام کر دیا گیا
پھر اس کے بعد ہر خوشی کو عام کر دیا گیا

میں مفلسی کی زد میں تھا سو محفلِ نشاط میں
میرے لئے الگ سے انتظام کر دیا گیا

زبانیں کاٹ دی گئیں علَم جلا دیے گئے
تمام مسئلوں کو یوں تمام کر دیا گیا

جواز ڈھونڈتے ہو کیوں ضرورتوں کی آڑ میں
حرام ہی رہے گا جو حرام کر دیا گیا

ہماری التماس پر وہ منہ بنا کے چل دیئے
تمام خواہشوں کا قتل عام کر دیا گیا

اساتذہ کے سامنے جو با ادب کھڑے رہے
انہیں جہانِ علم کا امام کردیا گیا

زمانہ معترض نہ ہو شکیلؔ بس یہ سوچ کر
ہما را ذکر بھی برائے نام کر دیا گیا

☆

ہم ایسوں کو مت اپنی پہچان میں رکھ
تو بھی رُسوا ہوجائے گا دھیان میں رکھ

☆

دریا نے میرے ساتھ تغافل کِیا تو کیا
میں بھی تو اُس کی سمت کبھی دیکھتا نہ تھا

☆

میں نے دانستہ کیا تھا ذکرِ ویرانی شکیلؔ
اُس نے برجستہ مِرے گھر کا حوالہ دے دِیا

غزل

پوچھ کر حال اس نے مجھ کو غرقِ حیرت کر دیا
کچھ نہ سوچا میں نے اظہارِ محبت کر دیا

دیکھتے ہیں دیکھنے والے مجھے حیرت سے اب
آپ نے تو آ کے میرے گھر کو جنت کر دیا

ہے اسی کے قبضۂ قدرت میں یہ سارا جہاں
اس کی مرضی جس کو جو چاہا عنایت کر دیا

کچھ بھی کہتا تو چھلک جاتا میرے اندر کا دُکھ
میں نے اس کا ہاتھ چوما اور رخصت کر دیا

دل کو تڑپاؤ نہ یوں بننا سنورنا چھوڑ کر
سادگی نے اور تم کو خوبصورت کر دیا

دی زباں اہلِ وفا کو میرے شعروں نے شکیلؔ
میں نے بہروں کو عطا ذوقِ سماعت کر دیا

غزل

تم منانا بھی چاہتے ہو مجھے
پھر ستانا بھی چاہتے ہو مجھے

میری چاہت پہ ہے بھروسہ بھی
آزمانا بھی چاہتے ہو مجھے

ہر گھڑی یاد کرتے رہتے ہو
بھول جانا بھی چاہتے ہو مجھے

مجھ کو سن کر خفا بھی ہوتے ہو
گنگنانا بھی چاہتے ہو مجھے

بھولنے کا سوال رکھتے ہو
یاد آنا بھی چاہتے ہو مجھے

پوچھتا ہوں تو ٹال دیتے ہو
کچھ بتانا بھی چاہتے ہو مجھے

صرف سننے کی آرزو ہے شکیلؔ
یا سنانا بھی چاہتے ہو مجھے

غزل

ہم نے دیکھا ہے اس کو چلتے ہوئے
رنگ کو روشنی میں ڈھلتے ہوئے

وقت کے ساتھ چلنے والے لوگ
تھک کے بیٹھے ہیں ہاتھ ملتے ہوئے

میرے گھر کی طرف بھی ہو لینا
اپنے گھر کی طرف نکلتے ہوئے

ہم نے ایک عمر کاٹ دی جاناں
اپنے جذبات کو کچلتے ہوئے

تیری باتوں پہ ہم نے غور کیا
رات بھر کروٹیں بدلتے ہوئے

یار میں نے تجھے سنبھالا ہے
مت گِرا تو مجھے سنبھلتے ہوئے

مجھ کو ڈسنے لگے ہیں رہ رہ کر
آستینوں میں سانپ پلتے ہوئے

ہوں میسّر تو میری قدر کرو
ورنہ بیٹھو گے ہاتھ ملتے ہوئے

ہم نے دیکھا ہے دوستوں کو شکیلؔ
موسموں کی طرح بدلتے ہوئے

☆

کیا پتہ آج کل ہے وہ کس حال میں
کچھ دِنوں سے کوئی رابطہ بھی نہیں

☆

جانتے ہو ہمارا دُکھ کیا ہے
ہم نے اپنوں سے چوٹ کھائی ہے

☆

ہچکیاں آ رہی ہیں رہ رہ کر
وہ مجھے یاد کر رہے ہوں گے

غزل

سُنا ہے جان لے کر دوست پیچھا چھوڑ دیتے ہیں
اگر یوں چھوڑ دیتے ہیں تو سستا چھوڑ دیتے ہیں

عذابِ آگہی سنجیدہ کر دیتا ہے فطرت کو
شعور آتے ہی بچے مسکرانا چھوڑ دیتے ہیں

کچھ ایسے وصف بھی ہیں جو زباں پر لا نہیں سکتے
تعارف دوستوں کا ہم ادھورا چھوڑ دیتے ہیں

عمل سے ہم کو جھٹلانا ہے بدخواہوں کا یہ دعویٰ
جو بن جاتے ہیں شاعر کام دھندہ چھوڑ دیتے ہیں

ہمارے حوصلے حل ڈھونڈ لیتے ہیں مسائل کا
وہ ہوں گے اور جو گھبرا کے دُنیا چھوڑ دیتے ہیں

تعلق کے لئے کچھ وصف کا ہونا ضروری ہے
پرندے بے ثمر پیڑوں پہ آنا چھوڑ دیتے ہیں

شکیلؔ اس پر بھی اِتراتے ہوئے دیکھا ہے لوگوں کو
جو مضموں ہم سمجھ کر عامیانہ چھوڑ دیتے ہیں

غزل

کہوں کیا تہمتیں دیدہ وری قسمت میں لکھی تھی
بساطِ شب کی آئینہ گری قسمت میں لکھی تھی

نہ ہوتے تم تو کوئی اور منظر ہوش اُڑا دیتا
جو سچ پوچھو تو یہ جامہ دری قسمت میں لکھی تھی

مِرے احباب میرے نام کی شمعیں جلاتے ہیں
شکایت کیا کروں پس منظری قسمت میں لکھی تھی

اگر ہم چاہتے تو دونوں عالم دسترس میں تھے
بہ ایں خود اختیاری چاکری قسمت میں لکھی تھی

فضا کی وسعتیں آواز دیتی رہ گئیں مجھ کو
میں کیا کرتا کہ بے بال و پری قسمت میں لکھی تھی

نجومی نے بتایا تھا کہ بے فکری کے دِن ہوں گے
کھُلا آخر کہ دریوزہ گری قسمت میں لکھی تھی

شکیلؔ آئینۂ احساس کا انجام کیا کہئے
بُتانِ سنگ دِل کی دِلبری قسمت میں لکھی تھی

غزل

بھورے بادل جب پانی ہو جاتے ہیں
جنگل کے جنگل دھانی ہو جاتے ہیں

عمریں کٹ جاتی ہیں دوست بنانے میں
دُشمن تو با آسانی ہو جاتے ہیں

فطرت کھیلوں میں بھی رنگ دِکھاتی ہے
کچھ بچے راجا رانی ہو جاتے ہیں

عہد جوانی نام ہے وحشت خیزی کا
جذبے خود ہی طوفانی ہو جاتے ہیں

جب کوئی دُشمن کے عیب گِناتا ہے
شرم سے ہم پانی پانی ہو جاتے ہیں

ذِکر جب اُن کا محفل میں چھِڑ جاتا ہے
سب کے چہرے نورانی ہو جاتے ہیں

صدیاں ان کو دُہراتی رہتی ہیں شکیلؔ
اچھے نغمے لافانی ہو جاتے ہیں

GUL-E-TAR

(POETRY) 2019

BY SHAKEEL IBNE SHARAF
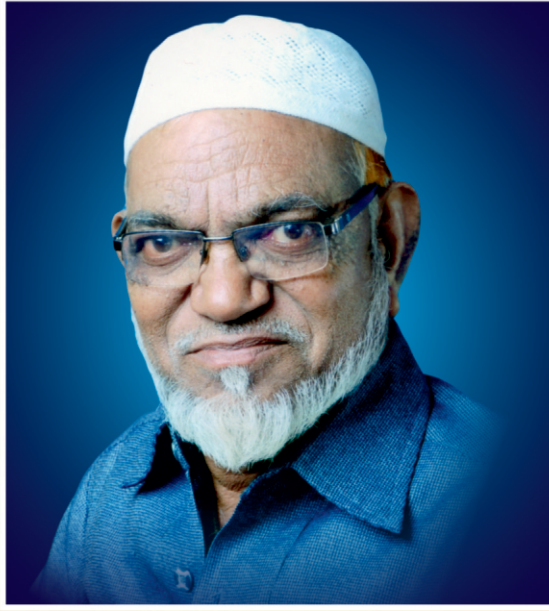
میں کہ اِس دور میں اُمیّدِ وفا رکھتا ہوں
لوگ حیرت سے تکا کرتے ہیں صورت میری
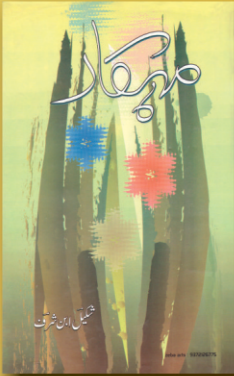
سنِ اشاعت ۲۰۱۲ء

سنِ اشاعت ۲۰۰۴ء

BAZM-E-MUHIBBAN-E-SHAKEEL
Fish Market, Dhule- 424001

بزمِ محبّانِ شکیل، مچھلی بازار، دھولیہ